اسلامی

تقریبات

سن ہجری کا سال نو، جمعہ، عرس، حج کی تقریبات، یوم عاشورا، عیدین کی تقریب، میلاد النبیؐ شب معراج، شب برات، لیلۃ القدر، کتاب و سنت کی روشنی میں

مولانا محمد عنایت اللہ وارثی

پروگریسو بکس ۰ ۴۰-بی اردو بازار ۰ لاہور
فون ۵۲۷۹۵

بار اول: ۱۹۸۵ء
مطبع: حامد اینڈ کمپنی پرنٹرز، پبلشرز، لاہور
پبلشر: پروگریسو بکس ۴۰۔ اردو بازار لاہور
قیمت: ۳۳ روپے
گجرات میں ملنے کا پتہ: ظفر بک ایجنسی محلہ فیض آباد (بالمقابل جامع مسجد) سرگودہا روڈ۔
گکھڑ میں " " " :

حکیم قاضی محمد امین انجم خوشنویس، ناظم "امین الصحت دواخانہ"
محلہ عیدیاں والہ، پیرکوٹ روڈ، گکھڑ منڈی، ضلع گوجرانوالہ

فہرست مضامین

6 ۱۹۹ کل صفحے

انتساب

مصنّفین میں رواج ہے کہ ہر کتاب کے صفحۂ اوّل پر کسی نہ کسی شخصیت کے نام سے کسی نہ کسی حیثیت کے پیشِ نظر اپنی کتاب کو منسوب کر کے موضوعِ تصنیف کی طرف بھی اشارۃً توجہ دلا دیتے ہیں۔

میں نے چونکہ ان اوراق میں زمان و مکان اور شخصیات سے بھی قطع نظر ہر مادی نسبت کے بجائے اپنی اور قارئین کی توجہ محض مشیتِ الٰہی اور کائنات کی روحانی علت العلل اور احکامِ خداوندی کی عملی پابندی کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی ہے، اس لیے انتساب کی رسم پوری کرنے کے لیے بھی ابن طقطقی کے الفاظِ ذیل کو یہاں درج کر دینا کافی سمجھا ہے اور اس کتاب کو خدائے برتر کے بلند نام سے منسوب کیا جا رہا ہے۔

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَبِهٖ اَسْتَعِيْنُ ط

☆ (" اگر عنایتِ الٰہی کا ایک ذرہ بھی کسی شخص پر پڑ جائے تو وہ نبی، امام یا فرماں روا ہو جاتا ہے۔ اگر وقت کے کسی حصے پر عنایت ہو، تو سارے عالم کے لیے یومِ عید، لیلۃ القدر، ایّام الحج اور موسمِ زیارات بن جاتا ہے۔ اگر کسی جگہ پر یہ عنایت ہو تو وہ کعبہ، بیت المقدس، جامع مسجد، زیارت گاہ، عبادت خانہ اور تقربِ الٰہی کا مقام بن جاتا ہے")

(کتاب الفخری لابن طقطقی)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؀

پیش لفظ

وَمِنۡ اٰیٰتِہِ الَّیۡلُ وَ
النَّہَارُ وَالشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ ؕ لَا تَسۡجُدُوۡا لِلشَّمۡسِ وَلَا لِلۡقَمَرِ
وَاسۡجُدُوۡا لِلّٰہِ الَّذِیۡ خَلَقَہُنَّ اِنۡ کُنۡتُمۡ اِیَّاہُ تَعۡبُدُوۡنَ ؀

"اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں یہ رات اور دن اور سورج اور چاند،
سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ اس خدا کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا
کیا ہے اگر فی الواقع تم اسی کی عبادت کرنے والے ہو"

تمام تقریبات کی جو کسی بھی نام پر منائی جاتی ہیں اصل بنیاد صرف دن اور تاریخیں ہیں جو سورج اور چاند کی گردش کی بنا پر دن اور رات کی صورت میں سامنے آتی رہتی ہیں۔ یہ خدا کے مظاہر نہیں کہ ان کی پوجا پاٹھ کو خدا ہی کی پرستش سمجھ لیا جائے۔ بلکہ یہ محض اس کی لاتعداد نشانیوں میں سے چند نشانات ہیں، ان کا احترام خدا کا احترام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر ان کے احترام میں خدا کی عبودیت اور خدا کے احترام ہی کا دعویٰ ہے، تو براہ راست خدا ہی کی بندگی کا دم کیوں نہیں بھرتے جو ان کا پیدا کرنے والا ہے؟ جو کسی وقت، دن اور تاریخ کی ہر قید سے آزاد، بے نیاز ہر وقت، ہر جگہ حاضر اور موجود ہے۔

شرک اور بدعات کے ہزارہا لامتناہی طریقوں میں سے اکثر کی بنیاد تقریبات کی پاسداری اور احترام کا بے بنیاد جذبہ ہی نظر آئے گا جسے بڑی بے تکلفی اور سہل انگاری سے

بدنصیب مسلمانوں نے پورے شوق اور انہماک کے ساتھ اختیار کر رکھا ہے اور زندگی کا معمول بنا لیا گیا ہے۔

دنیا کے معاملات میں تو کہنے کو "ہر چڑھتے سورج کی پرستش" کو ذلیل ترین غلامی کی علامت قرار دیتے ہیں لیکن عقیدے کے سلسلہ میں خوش اعتقادی کے اندھے جذبے سے متاثر ہو کر دین کی حقیقی دنیا اور عاقبت کی سچی راہ میں قدم قدم پر ہر دن نئی نئی تقریبیں منا منا کر ہر چڑھتے سورج کی پرستش ہی کو اصل دین یقین کر لیتے ہیں اور اس غیر خدا کی ذلیل غلامی کو عار و ننگ کے بجائے فخر کی علامت سمجھتے ہیں۔

اس ذہنی مغالطے میں اس وقت پوری اسلامی دنیا ایسی مبتلا ہے کہ اس کے مقابلے میں تمام بدیہی اور نفس الامری حقائق فراموش ہو چکے ہیں نقش کے فریب میں آ کر نقاش کا تصور اور یقین قلب اور ذہن سے ایسا محو کر دیا گیا ہے کہ کسی زاویۂ خیال میں بھی موجود نہیں رہ گیا (الاماشاء اللہ۔ تہوار منانے کا شوق اس حد تک غالب آ چکا ہے کہ بڑے بڑے زعمائے قوم اپنی برسیاں اور سالگرہیں آپ مناتے ہیں اور ہر شخص نے اپنے اپنے مولود نامے آپ پڑھنے شروع کر دیے ہیں۔)

عام مسلمانوں کی اس کم نگاہی اور دینی بے مائیگی کا احساس ہی اس داعیے کا محرک ہوا ہے کہ زیر نظر کتاب لکھ کر عوام کے سامنے رکھی جائے اور کتاب و سنّت کی روشنی میں وہ راہ دکھانے کی کوشش کی جائے جس راہ پر چلنے کے لیے موحّد اعظم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح چاند اور سورج کی زوال پذیر روشنی کی محبت، دل بستگی اور پذیرائی کا اقرار نہیں انکار لازم ہو۔ چہ جائیکہ سورج اور چاند کے پیدا کیے ہوئے دن رات اور تاریخوں تہواروں کی پرستش کی جائے (ایک سچے مومن کے سامنے یہ اجرام سماوی حتّٰی کہ نیّر اعظم تک قابلِ پرستش نہیں بلکہ پرستار، مسخّر اور خدمت گار ہیں، مخدوم نہیں خادم ہیں۔ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ۔ ان اپنے غلاموں کی غلامی سے بڑھ کر ایک سچے مومن اور آزاد موحّد کے

لیے اور کیا نتائج دعا ہو سکتا ہے؟

میں نے اپنی علمی بے بضاعتی اور کم سوادی کے باوجود محض دینی حمیّت اور اسلامی جذبہ کے تحت ان پیشِ نظر اوراق میں امکانی کوشش کی ہے کہ ان رسمی تقریبات پر عقلی اور نقلی دلائل کی روشنی میں غور کیا جائے کہ عالمِ اسلام اور بالخصوص ہندی یا پاکستانی مسلمانوں میں یہ بدعات کہاں سے آئی ہیں اور کس طرح مسلمانوں کی زندگی میں شامل ہو گئی ہیں؟ ان کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ ہندوؤں کی مذہبی رسوم مسلمانوں نے کس طرح قبول کر لی ہیں، یا ہندی نومسلموں نے اپنی آبائی رسوم و عادات اور ملکی طرزِ بود و باند کو ترک ہی نہیں کیا؟ اور پھر ان رسوم کے رواج و قبول نے اسلامی معاشرے کو کیا کیا نقصانات پہنچائے ہیں؟ — اب ان سے اور ان کے نقصانات سے بچنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

بہر حال یہ ایک تحریک ہے جس کی طرف اب تک بہت کم توجہ دی گئی ہے مسلمان کی زندگی چونکہ کتاب و سنت کے تحت ہی اسلامی زندگی ہو سکتی ہے اور فرمانِ نبویؐ کے مطابق ہر بدعت ایک سنت کو اٹھا دینے کا لازمی سبب بن جاتی ہے، اس لیے بدعت کے استیصال کے بغیر اسلامی زندگی کا وجود میں آنا امرِ محال ہے لہٰذا ضروری ہے کہ ان رسوم و عادات پر پوری توجہ دی جائے۔

ہو سکتا ہے کہ کوئی صاحبِ ہمت اس اہم موضوع پر مزید توجہ مبذول فرمائیں اور جس طرح ہندو کی مجاورت اور مصاحبت سے پاکستانی مسلمانوں کو نجات نصیب ہوئی ہے، اسی طرح ان کی تمدنی اور معاشرتی رسوم و آداب اور عادات کی تقلید سے بھی مسلمان بچ جائیں اور پاکستانی معاشرہ اسلام کی راہ پر چل سکے۔ وباللہ التوفیق

۴ ذی قعدہ ۱۴۰۳ھ
۱۴ اگست ۱۹۸۳ء

محمد عنایت اللہ وارثی
کوٹ وارث (گوجرانوالہ)

تعارفِ مُصنّف

ہمیشہ سے دستور چلا آرہا ہے کہ کتاب کا ہر مُصنّف یا مؤلّف کتاب کے شروع میں حمدِ باری تعالےٰ اور نعت رسول مقبول صلعم کے بعد امّا بعد کا لفظ لکھ کر کتاب کا مضمون شروع کرنے سے پہلے خود اپنا تعارف کراتا ہے۔ اور پھر کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد بلند پایہ مصنفین کی کتابوں کے ابتدائی صفحات پر ان مصنفین کے عقیدت مند لوگ ان بزرگوں کے حالات کسی قدر تفصیل سے درج کرتے ہیں۔ جس تفصیل کو ان کا ترجمہ کہا جاتا ہے۔ یہ بھی تعارف ہی کی ایک دوسری قسم ہے۔ لیکن چونکہ عمل کسی دوسرے کی طرف سے ہوتا ہے، لہذا اکثر اوقات تعارف سے زیادہ تعریف بھی بن جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں مصنف کا اپنا بیان اگر اس میں خودستائی کا جذبہ کارفرما نہ ہو تو وہ صحیح معنوں میں تعارف بھی ہو سکتا ہے۔

خدا کا ہزار شکر ہے کہ قدرت نے راقم الحروف کو، ا/ اکتوبر ۱۸۹۹ء کو ایک باوقار راجپوت خاندان کے علمی گھرانے میں آنکھیں کھولنے کا موقعہ دیا۔ ظاہر ہے اس میں میری کسی کوشش کا قطعاً کوئی دخل نہیں جس سے شکرِ خداوندی کے سوا فخر کا کوئی ادنیٰ پہلو بھی پیدا ہو سکے ۔ تاہم اس دوہرے فضل پر کیوں نہ شکر ادا کیا جائے کہ دولتِ علم کے ساتھ خوش حالی کی نعمت بھی وراثتاً ملی۔ کسی نے کہا ہے :-

مرا بہ تجربہ معلوم گشت آخرِ حال
کہ قدرِ مرد بہ علم است و قدرِ علم بہ مال

مولد و مسکن

کم و بیش پندرہ سو نفوس کی آبادی کا ایک چھوٹا سا گاؤں۔ کوٹ وارث۔ ضلع گوجرانوالہ کے قصبہ گکھڑ کی مغربی جانب تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہی میرا مولد اور مسکن ہے۔

نام و تخلص

محمد عنایت اللہ نام اور وارثی تخلص (کوٹ وارث کی نسبت سے) ابن محمد عبداللہ وارثی ابن حافظ حاجی فضل الٰہی۔ ابن میاں غلام قادر۔ ابن شرف الدین۔ ابن عبدالرزاق یہ راجپوت خاندان مدت سے اسی گاؤں میں آباد ہے۔ مزید تفصیلات میں اپنی خود نوشت سرگزشت "گردِ سفر" میں لکھ چکا ہوں۔

یہ اتفاقی امر ہے کہ اس طویل عرصہ میں اس خاندان میں کوئی خاص افراد کی ترقی نہیں ہوئی اس وقت بھی صرف تین کنبے چند افراد پر مشتمل اسی گاؤں میں اپنی جدی اور خود پیدا کردہ اراضی پر مقیم ہیں۔ گو کاروباری حیثیت سے بعض افراد مختلف مقامات پر کام کر رہے ہیں۔

راقم الحروف کا بڑا لڑکا حکیم محمد خالد (منشی فاضل۔ حکیم حاذق) کوٹ وارث ہی میں اپنے کامیاب مطب کی سرپرستی کے علاوہ اراضی کی کاشت اور نگہداشت میں مصروف ہے چھوٹا لڑکا محمد طارق ایم اے ان دنوں روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی کے دفتر میں بہ حیثیت ریذیڈنٹ ایڈیٹر کام کر رہا ہے۔ میرے چھوٹے بھائی الحاج عبدالقادر وارثی (مصنف "خدا کا اسلامی تصور" وغیرہ) کے بھی دو بیٹے ہیں۔ بڑے لڑکے ڈاکٹر سیف الرحمٰن خاں بی اے کافی عرصہ حکومت کی طرف سے مستنط رہے۔ اب یہیں پریکٹس کر رہے ہیں ان سے چھوٹے پروفیسر فاروق اختر نجیب آجکل ڈپٹی ڈائرکٹر تعلیم کی حیثیت سے لاہور دفتر میں ملازم ہیں۔ ان کی مشہور تصنیف ضخیم کتاب "سیاست و ریاست" دو جلدوں میں بی اے اور ایم اے کے کورس سے متعلق ہے۔

تیسرے کنبہ کے سرپرست میرے بھتیجے الحاج رشید احمد وآرٹی لاہور نوائے وقت کے دفتر میں بطور انچارج شعبۂ کتابت کام کر رہے ہیں۔ باقی افراد بھی اپنی اپنی جگہ کسی نہ کسی علمی حلقہ سے متعلق ہیں۔

ذاتی علمی مشاغل

میں نے فارسی عربی ادب اور حدیث، فقہ، تفسیر، معقول و منقول وغیرہ علوم کے سلسلے میں درس نظامی کے مطابق اپنے والد ماجد بزرگوار ہی سے تعلیم حاصل کی فن طب میں بھی پوری واقفیت حاصل کی۔ عربی قواعد کی تکمیل کے لیے قبلہ والد مرحوم نے مولانا نور احمد صاحب مرحوم امرت سری کو یہاں رہنے کی تکلیف دی تھی۔ خدا انہیں جوار رحمت میں جگہ دے۔ علاوہ ازیں عربی، اردو کتابت کا فن بھی اپنے والد بزرگوار مرحوم سے جو کہ اعلیٰ پایہ کے خوش نویس تھے، سیکھا۔ جبکہ سینکڑوں کی تعداد میں مستمند لوگ ہمارے خاندان سے یہ فن کتابت سیکھ کر باعزت زندگی گزار رہے تھے اور ہیں۔

۱۹۳۲ء میں ماہ نامہ حقیقتِ اسلام لاہور کی ادارتی ذمہ داریاں سنبھالیں لیکن کچھ عرصہ بعد واپس گاؤں آجانے پر مجبور ہو گیا۔ کیونکہ گاؤں میں ہندو مسلم کشیدگی اس وقت عروج کو پہنچ چکی تھی۔ جو اس سے پہلے ایک برہمن نوجوان مولا مل ولد پرمانند اور ایک ہندو ساہوکار منشی رام کے جوان بیٹے دینا ناتھ کے مسلمان ہو جانے سے شروع ہوئی تھی یہ دونوں میرے ہم عمر اور دوست تھے۔ ان حالات میں گاؤں سے مسلسل غیر حاضری دشوار ہو گئی۔

سیاسی معاملات میں ہمیشہ پورا دخل و عمل رہا اس کی تفصیل ایک علیحدہ باب ہے۔ ۱۹۴۶ء کی فیصلہ کن انتخابی مہم اور انقلابی ہنگاموں میں پوری سرگرمی کے ساتھ مسلم لیگ کی زیر قیادت حصہ لیا۔

۱۹۴۸ء میں "العصر" کے نام پر ایک ہفت روزہ پرچہ جاری کیا جو ۱۹۸۱ء تک ٹی

کامیابی کے ساتھ چلتا رہا تینتیس ۳۳ سال ملک و ملت کی دینی اور سیاسی خدمت انجام دی۔ "العصر" کے اکثر مضامین ملک کے مقتدر رسائل اور روزناموں میں بھی نقل ہو کر شائع ہوتے رہے۔ آخر حکومت نے ۱۹۸۱ء میں تیسری مرتبہ جب ڈیکلریشن ضبط کیا تو مجبوراً اس علمی مصروفیت سے بصد حسرت دست بردار ہونا پڑا۔

کئی چھوٹے چھوٹے وقتی ضرورتوں کے تحت لکھے گئے رسائل اور کتابچوں کے علاوہ "غزواتِ مقدس" کے نام پر ایک بالکل اچھوتا موضوع سامنے رکھ کر سیرت پر کتاب لکھی گئی جس کا دوسرا ایڈیشن مکتبہ تعمیر انسانیت، اردو بازار لاہور نے شائع کیا۔[۱] یہ مسلمانوں کی تاریخ کے بجائے اسلام کی تاریخ پر لکھی گئی ہے۔ کون کون سے اثبات کس کس طرح اسلامی تحریک پر اثر انداز ہوئے۔

اس زیرِ نظر کتاب "تقریبات" کے علاوہ "خدا ایک کیوں؟" "مسلمان کی دنیا" اور "نفسیاتِ غلامی" وغیرہ کتب زیرِ طبع ہیں۔ اخبارات میں حسب ضرورتِ وقت علمی، فنی، سیاسی اور دینی مضامین اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں فنِ کتابت پر مبتدیوں کی اصلاح کے لیے ایک گائیڈ بعنوان "مرقع خوش خطی" بھی تیار کی جو کہ میرے دوست اور شاگرد عزیز میاں سلطان احمد کاتب نے اپنے مکتبہ ظفر، گجرات سے شائع کی۔

بہرحال خدا کے فضل سے خاندان کے ہر فرد میں دعوت و تبلیغ کا جذبہ ہمیشہ موجود رہا ہے اور ہے۔ جسے ہر ایک اپنی ہمت کے مطابق اپنی اپنی جگہ استعمال کر رہا ہے۔

سببِ تصنیف

مصنف کے اس مختصر تعارف کے بعد تصنیف کا تعارف بھی ضروری نظر آتا ہے۔

چونکہ خدا تعالیٰ نے جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے اپنے فضل و کرم سے اس خاندان کو مرفہ الحال معاشرے میں اثر و رسوخ، شہ لفیانہ وقار و اقتدار کے ساتھ دینی حمایت کا جذبہ بھی ارزانی فرما رکھا ہے (اس لیے امر معروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے میں کوئی بیرونی اثر اور دباؤ حائل نہیں ہو سکا منبر و محراب کی پُر امن، محفوظ اور معصوم فضا میں منکرات و بدعات

---

[۱] پہلا ایڈیشن مبارک کمپنی وسن پورہ لاہور نے چھاپا تھا۔

کی زبان سے تردید کر دینا کوئی مشکل کام نہیں، کانوں سے سنی ہوئی باتوں کو دہرا کر دوسرے کانوں تک پہنچا دینا بھی آسان ہے، لیکن منکرات و فواحش کے اڈوں پہ پہنچ کر اور فحاشی کے مجمعوں میں گھس کر اپنی آنکھوں سے دیکھنا اور اپنے ہاتھوں سے روک کر "فلیغیّرہ بیدہٖ" کا فریضہ ادا کرنا، چیزے دیگر ہے۔ اس صورتِ حال کے بغیر نہ منکرات کے معاشری نقصانات کا ذاتی علم ہو سکتا ہے اور نہ اس عملی مدافعت کے بغیر یہ اندازہ ہی ہو سکتا ہے کہ ان بدعات و منکرات کے شجرۂ خبیثہ کی جڑیں معاشرے میں کس حد تک گہری جا چکی ہیں۔

چونکہ معاشرے کے ہر طبقہ بالخصوص زمیندار طبقہ سے جسے پنجاب ایسے زرعی ملک میں ہمہ اقتدار حیثیت حاصل ہے پورا ربط و ضبط تھا، ان رسمی تقریبات اور تقریبات کی رسموں کو جو منکرات کی جڑ ہیں، پاتال تک دیکھنے کا پورا موقعہ ملا اور ان جڑوں کو اکھاڑنے کی عملی کوشش کی، جن کوششوں کا ذکر "گردِ سفر"[1] میں کر چکا ہوں۔ خدا کے فضل سے کردار کے غازی کی صورت میں یہ تجربہ سامنے آیا ہے۔

کچھ معذرت

اگر اس کش مکش کی روئیداد کے بیان میں کہیں کوئی حرفِ برہنہ بھی زبانِ قلم پہ آگیا ہے تو اسے کمالِ گویائی کے آداب کے خلاف نہ خیال کیا جائے۔ سچے جذبات کا سچا تقاضا سمجھا جائے۔ آخر بدعات کی خاردار جھاڑیوں کے تیز کانٹوں کو کن ریشمی رومالوں میں لپیٹا جا سکتا ہے؟ کانٹا آخر کانٹا ہے، اس کی خلش کا ہدف دوست بھی بن سکتا ہے اور دشمن بھی۔

بہر حال اپنی طرف سے نرم زبان استعمال کرنے کی امکانی کوشش کی گئی ہے تاہم برائی کو برائی نہ کہا جائے تو اس کی تردید کا سوال ہی کیا پیدا ہو سکتا ہے؟ اور بُرائی سے ہمدردی کوئی اچھی علامت بھی نہیں۔ ؎

من آنچہ شرطِ بلاغ ست با تو می گویم
تو خواہ از سخنم پند گیر و خواہ ملال

محمد عنایت اللہ وارثی۔ ۱۳ مئی ۷۴ء

[1] خود نوشت سوانح حیات مصنف

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیمؒ

تقریبات انسان کی تخلیق ہیں یا انسان تقریبات کا پرستار

نہ تو زمین کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

تقریب کے لغوی اور اصطلاحی معنی

"صراح"۔ تقریب۔ نزدیک گردانیدن (ایک شے کا دوسری شے کے قریب کرنا)۔
"منتخب اللغات"۔ تقریب۔ نزدیک گردانیدن و نوعے از دویدن اسپ۔ وآں برداشتن ونہادن ہر دو دست است یک بار در دویدن (ایک شے کو دوسری شے کے قریب کرنا۔ اور گھوڑے کی دوڑ کی ایک قسم ہے جس میں دوڑتے ہوئے اگلے دونوں پاؤں کو ایک ہی بار اٹھاتا اور رکھتا ہے)۔
"غیاث اللغات"۔ تقریب۔ نزدیک گردانیدن۔ و باصطلاح راندن سخن بوجہیکہ مستلزم مطلوب باشد (ایک شے کو دوسری شے کے قریب کرنا) یہ لغوی معنی ہیں جیسا کہ صراح اور منتخب اللغات نے کہے ہیں۔ دوسرے معنی جنہیں غیاث نے اصطلاح کہا ہے۔ وہ "ایسے طریقہ سے بات کرنا ہے جو مطلوب شے کو حاصل کرنے کا مستلزم ہو" یعنی مطلوب مقصد کے حصول کا ذریعہ بن سکے۔

("تقریب" کا لفظ بے شک عربی لغت سے متعلق ہے۔ لیکن جن معنوں میں یہ لفظ آج استعمال ہوتا ہے اور عموماً استعمال ہو رہا ہے، ان معنوں کو لغوی معنی نہیں

کہا جا سکتا۔ البتہ اصطلاح بھی ایسی نہیں جس پر عام اتفاق ہو۔

(سال میں مختلف اوقات پر مسلمانوں نے بعض تاریخیں متعین کر رکھی ہیں جن پر کچھ رسوم و عادات کا اعادہ ہوتا ہے وہ بھی کہیں کچھ اور کہیں کچھ۔ انہیں ادا کرنے والے اسلام کے نام پر ادا کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں حصول ثواب کے متوقع بھی ہوتے ہیں۔ یعنی ان عوامل کو انجام دے کر قربِ الٰہی اور ان اعمال کو بارگاہ خداوندی میں تقرّب کا ذریعہ یقین کرتے ہیں)۔ لہٰذا لغت میں تو سالانہ تہوار منانے کے معنی میں "تقریب" کا لفظ استعمال نہیں ہوا البتہ اصطلاح میں چونکہ تقریب کا لفظ ایک ایسے مفہوم پر استعمال ہو سکتا ہے جس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے کوئی بات ایسے انداز سے کی جائے جو بات کرنے والے کو مدعا کے قریب کر دینے کا ذریعہ بن سکے۔ گویا یہ اصل مدعا کہیں حصولِ مدعا کے دیگر ذرائع کے ساتھ یہ بھی ایک ذریعہ ہے یا ذریعہ سمجھ لیا گیا ہے بہر حال مدعا سے یہ ایک مختلف شے ہی ہو گی۔

اب لغات کی مذکورہ وضاحت، اور اصل عبارتوں پر ایک مرتبہ پھر غور کر لیں صاف معلوم ہو جائے گا کہ مروجہ تہواروں یا تہواروں کے زیرِ عمل رسوم و آداب خواہ ان کو اسلامی نام ہی کیوں نہ دے لیا جائے اور اسلامی تہذیب و تمدن کی علامت ہی کیوں نہ یقین کر لیا گیا ہو۔ بہر حال تقریب کا لفظ ان تہواروں کے لیے ایک خود ساختہ اصطلاح سے زیادہ کچھ نہیں۔ ان رسوم و آداب کو ذاتِ الٰہی کے تقرب کا حتمی ذریعہ یقین کر لینا یا بارگاہِ خداوندی کے قرب کی ضمانت سمجھ لینا حقیقت پسندی نہیں۔ وہم پرستی ہے اور ایک ذہنی مغالطہ ہے۔

(بالخصوص جب ان خاص دنوں اور تاریخوں کی پابندی ہی کو تقریب کی بنیاد بنا لیا گیا ہو تو یہ عمل ایک ایسی شے کی پرستش کے مستلزم بن جائے گا جس کا خود اپنا وجود قابلِ غور اور محل نظر ہے۔ میری مراد وقت، دن اور تاریخ سے ہے۔ یہ چیزیں خود اپنا

کوئی مستقل وجود نہیں رکھتیں۔ یہ قربِ احدیت کی حقیقتِ کبریٰ کے حصول کی ضمانت کیا دے سکتی ہیں۔

وقت کیا شے ہے؟

زمانہ یا وقت کو تین حالتوں پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک ماضی جو گزر چکا ہے۔ دوسرے مستقبل جو آنے والا ہے اور تیسرے حال جسے سامنے موجود سمجھا جاتا ہے۔ اب اس کا تجزیہ کیجئے۔ ماضی تو ہاتھ سے یقیناً نکل جا چکا ہے۔ جس کا حاصل کرنا اور واپس لانا حقیقتاً محالات سے ہے۔ اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ اسی طرح مستقبل کے متعلق بھی کوئی عقلمند وثوق سے نہیں کہہ سکتا، کہ اسے حاصل کر سکے گا۔ اسی بنا پہ کسی نے کہا ہے:۔

گزشت ماضی و معلوم نیست استقبال
زمانِ حال غنیمت شمار در ہمہ حال

(ماضی گزر چکا اور مستقبل کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ اس لیے بہرحال حال ہی کو غنیمت سمجھنا چاہیئے۔)

لیکن کہنے والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ حال ہے کہاں؟ ادھر ماضی گزرا اور ہاتھ سے نکل گیا۔ جب ہی تو اسے ماضی کہا گیا ہے۔ کہ وہ گرفت سے نکل چکا ہے۔ اور مستقبل ہی نے اسے آکر ختم کیا ہے۔ لہٰذا تیسری کوئی شے کہاں سے آگئی؟ جسے حال کا نام دیتے ہو؟

درحقیقت "وقت" اُس مدت کا نام ہے جو مدت کسی کام کے کرنے پر صرف ہو۔ اس لیے "وقت" کسی عمل کے بعد ہی وجود میں آنے والی شے ہے۔ بذاتِ خود اس کا کوئی وجود نہیں، اصل وجود عمل ہی کا ہے ـــــ لیکن وقت، دن اور تاریخوں کو

یاد رکھنے والے اور ان اصل یاد رکھنے والے کارناموں کو فراموش کر دینے والے جو کارنامے وقت کے وجود کا اصل سبب بنتے ہیں، ایسے خود فراموش لوگ حقیقت کو چھوڑ کر وہم کے پرستار نہیں تو اور کیا ہیں؟

جن کارناموں اور انسانی اعمال کی بدولت یہ وقت وقت بن کر سامنے آتے اور یہ دن دن بنے اور یہ تاریخیں تاریخیں اور پھر تقریبیں بن سکیں یا بنا لی گئیں، ان کی یاد بھی ذہنوں میں محفوظ نہیں اور ان سہل انگار اور کام چور لوگوں نے صرف دنوں کو یاد رکھ لیا۔

اس راہ میں یہی پہلی گمراہی ہے کہ ان بڑے بڑے کارناموں کو جو اللہ کے نیک مخلص بندوں نے خدا کی سچی راہ میں انجام دیئے۔ دنوں اور تاریخوں کو یاد رکھنے والوں نے فراموش کر دیا۔ اور پیروی کرنے کے بجائے ان کے نیک طریقوں کے برعکس نئے نئے طریقے اپنی طرف سے ایجاد کر لیے اور عمل کے بجائے جو اصل حقیقت تھی وقت دن اور تاریخوں کو یاد رکھنا ضروری قرار دے لیا۔

ایک نفسیاتی تجزیہ

انسانی حواس کی محدود قوتیں ایک وقت میں ایک ہی کام انجام دے سکتی ہیں کوئی شخص اگر کسی آواز کو پوری توجہ اور انہماک سے سن رہا ہے تو اس کی باقی قوتیں اس وقت بڑی حد تک معطل ہوں گی۔ اس کے سامنے سے کوئی گزر جائے وہ نہیں جان سکے گا۔ اسی طرح اگر پوری توجہ سے کسی شئے کو دیکھ رہا ہے تو کان پڑی آواز بھی سن نہ سکے گا اور سننے کے باوجود سمجھ نہ سکے گا۔

اس لیے لازم ہے کہ وقت، دن اور تاریخوں کو یاد رکھنے والے اسی وقتی اور عارضی مصروفیت ہی میں کھو کر رہ جاتے ہیں، ان سعادتوں، برکتوں اور رحمتوں سے یکسر محروم رہتے ہیں جو بزرگانِ دین اور رہنمایانِ راہِ ہدیٰ کے عملی کارناموں کی پیروی

کرنے سے حاصل ہو سکتی ہیں اور ہونی چاہئیں۔ کیونکہ انسانی حواس ایک وقت میں ایک ہی کام کر سکتے ہیں۔

یہ حقیقت کسی وقت فراموش نہ ہونی چاہیئے کہ وقت بعد کی چیز ہے۔ اصل مقام عمل کو حاصل ہے۔ اولیت کا درجہ عمل کو حاصل ہے۔ عمل نہ ہو تو وقت کا وجود ہی مشخص نہیں ہو سکتا کیونکہ وقت اسی مدت کا نام ہے جو کسی کام کے کرنے پر صرف ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دنوں کی پرستش کرنے والے اصل مقام سے دور ہو کر پہلے قدم پر ہی راہ سے بھٹک جاتے ہیں اور ایسا راہ رَو جو اصل منزل کی مخالف سمت رُخ کر کے ہر قدم پر منزل سے دور ہوتا جائے گا اور جس قدر تیز چلنے کی کوشش کرے گا اس کی تیز رَوی اور گرم جوشی اُسے اسی قدر تیزی کے ساتھ منزل سے زیادہ دُور کرتی چلی جائے گی۔

غرض دنوں کو ماننے والے صراطِ مستقیم سے ہٹ کر جو ایک اور صرف ایک ہی راہ ہو سکتی ہے بے شمار لامتناہی غلط راستوں پر چل نکلتے ہیں۔ ہم ذیل میں ایسی چند غلط فہمیوں، غلط اندیشیوں بلکہ گمراہیوں کا ذکر کرتے ہیں جس میں یہ لوگ مُبتلا ہیں۔

اب وقت کو عمل سے علیحدہ رکھ کر اسے اگر کوئی وزن، مقام اور نام دیا بھی جائے تو اسے ایک ایسی غیر متناہی مدت سے زیادہ کچھ نہیں کہا جائے گا جس کے ایک حصّہ کو دوسرے حصہ سے کوئی امتیاز نہیں دیا جا سکتا جس طرح دائرے کے محیط کا خط ہر طرف سے ایک جیسا ہے اور اس کے کسی ایک حصہ کو دوسرے حصہ سے کوئی امتیازی حیثیت یا علیحدہ نام نہیں دیا جا سکتا۔ بالکل اسی طرح وقت بھی ایک لامتناہی مُدّت ہو گی۔ لیکن وقت، دنوں اور تاریخوں ہی کو عمل کے مقابلے میں اہمیت دینے والے راہ گم کردہ لوگوں نے سب سے پہلی ٹھوکر دنوں میں سعادت اور نحوست کا بے بنیاد عقیدہ اختیار کر کے کھائی ہے جس نے عقائد و اعمال اور اخلاق و کردار کی ساری انسانی زندگی کی عمارت کو یکسر متزلزل کر کے عمل جیسی بنیادی اور ٹھوس حقیقت کو بے حقیقت کر دیا اور

انسان کو دائرۂ انسانیت ہی سے خارج کر دیا جس سے تمام انسانی شرف و مجد جو خدا کی ساری مخلوق اور کُل کائنات میں انسان کو صرف عمل ہی کی بنیاد پر حاصل تھا وہ ختم ہوگیا۔

کون نہیں جانتا کہ خدا کے تکوینی قانون کی تو ساری کائنات جمادات، نباتات اور حیوانات سے لے کر عالم مجردات تک طوعاً یا کرھاً پابند ہے لیکن شعوری طور پر خدا کے تشریعی قانون کا پابند انسان ہی ہے اور اسی شرف و مجد نے اس اشرف مخلوق کو خدا کی خلافت و نیابت کے منصب اعلیٰ پر پہنچایا ہے اور یہ شرف اس کو صرف اور صرف عمل کی بنیاد پر حاصل ہے اور حاصل ہو سکتا ہے ۔ نہ کہ دنوں اور تاریخوں کی سعادت و نحوست کے مفروضہ کی بنیاد پر۔

۲ ــــ اگر کوئی دن، دن ہونے کی حیثیت سے منحوس ہے اور کوئی دوسرا دن بھی صرف دن ہونے کی وجہ سے سعید ہے تو کم از کم اس ساری دنیا کے لیے ضرور منحوس اور سعید ہونا چاہیئے۔ دنیا کے جس حصہ پر اس دن اور اس تاریخ کا سورج تاریخ اور دن بن کر نکلا اور تاریخ دے کر غروب ہوا۔ نحوست کا اثر بھی ان سب لوگوں پر ایک جیسا ہونا چاہیئے اور سعادت کا اثر بھی جن پر اس تاریخ کا دن چمکا۔

لیکن ہم بداہتہً دیکھتے ہیں اور ہماری زندگی کے ایک ایک لمحہ کا مشاہدہ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ انسانی زندگی کے بڑے بڑے واقعات اور تاریخ کے انقلابی حادثات سے لے کر زندگی کے عام روزمرہ معمولات تک میں اس بے بنیاد عقیدے کی قدم قدم پر تردید ہو رہی ہے کہ ایک دن کو متبرک قرار دے لیا جائے اور ایک کو نامبارک ۔

روزمرّہ کی ضرورت کے تحت ایک آدمی کوئی شے خریدتا ہے، اگر دکان دار شے کی قیمت زیادہ حاصل کر لیتا ہے تو خریدار نقصان میں رہ جاتا ہے اور اگر کسی طرح خریدار کم قیمت دینے میں کامیاب ہو گیا ہے تو دکان دار خسارہ اٹھا جاتے گا۔ اسی طرح ہر خرید و فروخت کے وقت ایک کا نقصان ہی دوسرے کے فائدے کا سبب بن سکتا ہے۔

اور نفع و نقصان کی دونوں متضاد صورتیں ایک ہی دن ایک ہی تاریخ بلکہ ایک ہی وقت میں سامنے آتی ہیں۔ اگر سعادت اور نحوست کی خاصیت کسی وقت، کسی دن اور کسی خاص تاریخ میں تسلیم کی جائے تو لازماً منحوس دن کی نحوست سب پر ایک جیسی مرتب ہو اور متبرک دنوں کی برکت سے سب لوگ ایک جیسے مستفید ہوں۔

لیکن ایسا کسی وقت بھی نہیں ہُوا بلکہ ہمیشہ ایک کا نقصان ہی دوسرے کے نفع کا سامان بنتا رہا ہے، بنتا ہے اور یقیناً بنتا رہے گا۔ حکیم عرفی نے کیا خوب کہا ہے:

زمانہ گلشنِ عیش کرا بہ یغما داد
کہ گُل بہ دامنِ ما دستہ دستہ می آید

(زمانہ نے کس کے گلشنِ عیش کو لُوٹ کر تباہ کیا ہے کہ پھولوں کے گلدستوں سے ہماری جھولی بھری جا رہی ہے)

غرض جب تک کسی باغ میں پھولوں کی کیاری برباد نہ ہو۔ پھول بستروں کی رونق اور گلوں کے ہار نہیں بن سکتے۔ یہ ناممکن ہے کہ پھولوں کی کیاری بھی آباد رہے اور خوش نصیبوں کے دامن و بالیں بھی مہک اُٹھیں۔

دو فریق عدالت میں پیش ہوتے ہیں۔ فیصلے کا دن ہے۔ عدالت حکم سنا دیتی ہے۔ یہ فیصلہ لازماً ایک فریق کے حق میں ہے اور دوسرے فریق کے خلاف۔ جس کے حق میں ہے وہ اس دن کو یقیناً نہایت مبارک دن سمجھے گا خوشیاں منائے گا اور شیرینیاں تقسیم کرے گا۔ لیکن دوسرا فریق جس کے خلاف فیصلہ ہُوا ہے اس کے لیے یہ دن بدترین دن، منحوس اور غیر مبارک دن ہو گا وہ چیخ اٹھے گا۔ کہ خدایا ایسا منحوس دن زندگی میں مجھے دیکھنا نصیب نہ ہوتا ــــ کیا یہ دن ایک سا ہی نہیں؟ یہ تاریخ ایک نہیں؟ اور وہ ساعت ایک ہی ساعت نہیں جس ساعت میں یہ فیصلہ سنایا گیا ہے۔ اگر کسی دن، کسی ساعت، کسی تاریخ میں سعادت اور نحوست ہو تو

وہ سب کے لیے ہو لیکن سعادت اور نحوست کا تعلق کسی دن، تاریخ اور وقت سے ہرگز ہرگز نہیں

۳ — انسانی تاریخ کے ان تمام بڑے بڑے واقعات پر غور کہ جن سے کسی مخالف و موافق کو ذرہ برابر انکار نہیں۔ ہابیل و قابیل کا تنازعہ اور ہابیل کے حادثۂ قتل سے چل کر طوفانِ نوح، نمرود کی ہلاکت، قوم لوط کی تباہی، فرعون کی لاؤ لشکر سمیت غرقابی، اسرائیل کی نجات، عاد و ثمود کی بربادیاں، غرض جنگ بدر میں کفار کی عبرت ناک شکست اور مسلمانوں کی حیرت انگیز کامیاب فتح تک ایک ایک واقعہ پر غور کرو کیا ایک فریق کی تباہی و بربادی اور دوسرے فریق کی کامیابی و سلامتی کا ایک ہی دن، ایک ہی تاریخ اور ایک ہی وقت نہ تھا۔ اگر وقت تاریخ اور کسی دن میں نحوست کا اثر ہوتا تو سب نحوست کا شکار ہوتے اور اسی طرح اگر وقت میں سعادت کی تاثیر ہوتی تو طوفانوں کی ہلاکت انگیزیوں سے سب ہی محفوظ رہتے صرف نوحؑ کے ساتھی ہی نہ بچتے۔

لیکن یاد رکھو کسی وقت میں نہ نحوست ہے نہ سعادت۔ نحوست و سعادت کا تعلق انسان کے عمل اور فقط عمل سے ہے جس حقیقت سے دنوں کو دن ماننے والوں نے انکار یا بے توجہی کر کے عمل جیسی بنیادی حقیقت کو بے وزن کر دیا۔

رفعِ اشتباہ

بعض لوگوں نے اس سلسلہ میں ان روایات کا سہارا لیا ہے جو بعض دنوں اور راتوں کے فضائل میں آئی ہیں مثلاً جمعہ، لیلۃ القدر وغیرہ۔ ان پر تفصیلی بحث تو اصل مقام پر آئے گی البتہ یہاں اتنا ضرور یاد رکھنا اور ذہن میں رکھ لینا چاہیے کہ جو شخص بلا عذر جمعہ کے اجتماع میں شریک ہی نہ ہو اسے جمعہ کے دن کی برکت کیا نفع دے گی؟ اسی طرح ساری رات سورج نکلنے تک سو کر غفلت میں گزارنے والا کسی مبارک سے مبارک رات کے پورے وقت سے کیا فائدہ حاصل کر سکتا ہے؟

یہ حضرات قرآن کریم کی بعض آیات سے بھی دنوں کے سعد و نحس ہونے پر استدلال کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ سورۂ حم السجدہ کے دوسرے رکوع میں جہاں قوم عاد پر "ریحاً صرصراً" کی صورت میں عذاب کا ذکر کیا گیا ہے جو مسلسل سات رات اور آٹھ دن چلتی رہی۔ قرآن کریم کے الفاظ فِیْۤ اَیَّامٍ نَّحِسَاتٍ (منحوس دنوں میں) کے الفاظ دنوں کی نحوست کے ثبوت میں پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم کی نہایت مختصر تفسیر "جلالین" میں بھی مُفسّر علّام نے خدا اس پر رحمتیں نازل فرمائے اس شبہ کو رفع کرنے سے غفلت نہیں کی۔ نحسات کے لفظ کی تشریح مشئومات (شامت اعمال) کے لفظ سے کر کے نحوست کی وضاحت صرف "عَلَیْھِمْ" کا لفظ لکھ کر کر دی ہے۔ کہ ان دنوں کی نحوست کا تعلق صرف ان منکرینِ حق ہی سے تھا کسی اور پر کچھ اثر نہ تھا۔ حاشیہ لکھنے والے نے اگر مزید وضاحت کی ہے تو صرف اسی قدر کہہ دیا ہے کہ (لَا عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ) اس نحوست کا اثر کافروں پر ہی تھا مومنوں پر نہ تھا۔ جو یقیناً ان کے اپنے اعمال ہی کا لازمی نتیجہ تھا۔

حق و باطل کے معرکوں کے سارے دن خود ہی اس امر کی واضح شہادت ہیں کہ ایک ہی دن، ایک ہی تاریخ بلکہ ایک ہی ساعت کچھ لوگوں کے لیے انتہائی منحوس اور وہیں کے کچھ لوگوں کے لیے انتہائی مبارک بلکہ آزادی، غلامی سے نجات اور مستقبل کی تمام کامیابیوں اور کامرانیوں کا پیش خیمہ اور جشن نوروز تھی۔

ایک بہت بڑا مغالطہ اور خود فریبی کی انتہا

کسی دن کو تقریب کی صورت میں منانے والے حضرات خواہ کسی صورت میں منائیں، ان کا بنیادی تصور یہی ہوتا ہے کہ یہ دن وہی دن ہے جس دن میں فلاں ناقابلِ فراموش واقعہ رونما ہوا جس کو یادگار کی صورت دے کر سال بسال منانا اور اس

یاد کو تازہ رکھنا ضروری ہے کیونکہ اس دن میں رونما ہونے والے واقعہ نے اس دن کو قومی، سیاسی، دینی اور اعتقادی یا کسی بھی انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے یادگار منانے کی خصوصیت یا شرف و اعزاز بخش دیا ہے۔ اس لیے اسے یاد رکھنا ہی ارادت، عقیدت یا وفاداری کا ثبوت اور فخر کا سرمایہ ہے اور اسے بصورت یادگار مناتے رہنے ہی سے اصل واقعہ کا تعلق اس خاص دن کے ساتھ قائم رہ سکتا ہے جس کا قائم رکھنا ناگزیر ہے۔ گویا تقریب کی بنیاد دراصل عمل ہی ہے، چونکہ وہ عمل اس دن میں واقعہ ہوا ہے اس لیے اسے تقریب کی صورت میں منایا جاتا ہے۔

اب قابلِ غور سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا واقعی یہ دن فی الحقیقت وہی دن ہے جس دن میں آج سے صدیوں پیشتر یا سالہا سال پیشتر یا آج سے ایک ہی سال پیشتر یہ ناقابلِ فراموش واقعہ پیش آیا ہے جس نے اس دن کو یادگار بننے کا اعزاز بخشا ہے؟ اگر یہ دن فی الواقع وہی دن ہے، اجب تو اس دن کو تقریب کی شکل دینے کی کچھ نہ کچھ جواز کی صورت بن جاتی ہے، خواہ عمل ہی کی بنیاد پر ہو ـــــ لیکن

"کیا جو دن گزر جاتا ہے، وہ پھر واپس بھی آجاتا ہے اور آتا رہتا ہے؟"

مثلاً آپ نے اپنے جواں سال پیارے اکلوتے بیٹے کی تاریخ پیدائش آج سے چودہ پندرہ سال پہلے ۱۳۸۹ھ ربیع الاول کی پہلی تاریخ بروز اتوار مطابق ۱۸ مئی ۱۹۶۹ء ۵ جلیٹھ بکرمی ۲۰۲۶ کو انتہائی خوشی کا مبارک دن تصور کر کے سال بسال اس کی سالگرہ منانا شروع کر دی ہے۔ آپ بزعم خود واقعی ایک خاص دن کی پرستش نہیں کر رہے، بلکہ اس دن کو اس لیے یاد رکھ رہے ہیں کہ یہ دن آپ کی خوشی کا دن ہے اس دن میں آپ کو خوشی نصیب ہوئی ہے ـــــ لیکن آج کا یکم ربیع الاول جو آپ آج چودہ پندرہ سال گزر جانے کے بعد ۱۴۰۳ھ میں منا رہے ہیں، کیا فی الواقعہ یہ وہی دن ہے جو آپ کے چودہ سالہ لڑکے کی پیدائش کا دن تھا؟ یا وہ دن گزر چکا ہے؟ ـــــ کیا اس سال بھی یکم

ربیع الاوّل کو اتوار ہی کا دن ہوگا اور عیسوی یا ہجری بلکہ کئی مختلف سنوں کی وہی تاریخیں ہوں گی؟ آپ اس دن کو "وہی دن" کہہ کر یا سمجھ کر جو منا رہے ہیں، صرف دن ہی کی پرستش نہیں کر رہے بلکہ موہوم تصور میں ایک ایسے نام کی پوجا کر رہے ہیں جس کا مسمّٰی یعنی نام والا دن چودہ پندرہ سال ہوئے آپ کے ہاتھ سے نکل جا چکا ہے اور اس کا ہاتھ آنا ناممکنات سے ہے۔

غرض یہ ایک طرح ریاضی کا مسئلہ ہے جس کی بنیاد یقین پر ہوتی ہے، دو اور دو چار ہی ہوں گے تین یا پانچ نہیں ہوں گے۔ اس لیے یہ ناممکن ہے کہ جو دن گزر چکا ہے واپس آئے اور پچھلی تاریخوں کو چھوڑ کر آج نئی تاریخ شروع کر دی جائے اور یہ کہہ کر اسے تقریب کی صورت میں منایا جائے کہ یہ وہی دن ہے جس دن فلاں ناقابلِ فراموش واقعہ ظہور پذیر ہوا۔

لہٰذا اگر کوئی گزرا ہوا دن واپس نہیں آسکتا اور واقعی قیامت تک نہیں آسکتا تو کسی دن کو خصوصی حیثیت دینا اور اسے وہی دن کہنا بدیہی طور پر غلط ہے، غلط بیانی ہے یا انتہائی بے دماغی اور خود فریبی ہے۔

ان خود ساختہ تقریبوں کو جمعوں، عیدوں اور حجوں پر قیاس مت کرو۔ گزشتہ عید اگر ۱۴۰۱ھ کی ہے تو آئندہ عید ۱۴۰۲ھ کی ہو گی، اسی طرح ہر جمعہ ایک نیا جمعہ ہے، نئی تاریخ کا ہے اور شریکِ جمعہ ہونے والوں کے لیے بذاتِ خود ایک نیا پیغام اور نئی دعوتِ سعادت لے کر آتا ہے اسے وہ جمعہ نہیں قرار دیا جاسکتا اور نہیں کہا جائیگا جو جمعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ۱۲ ربیع الاول ۱ھ مدینہ منورہ میں داخل ہوتے ہوئے بنی سالم کے محلہ میں پڑھا اور پڑھایا جو ۲ دسمبر ۶۲۲ء کی تاریخ کا جمعہ تھا۔

اسی طرح ۱۴۰۱ھ کا حج وہ حج نہیں جو آپؐ نے بتاریخ ۹ ذی الحجہ ۱۰ھ کیا۔ اور اسے حجۃ الوداع کہا جاتا ہے اُس حج میں شریک مقدس ہستیاں اور تھیں دن اور تھا سال اور تھا وہ انہیں کا حج تھا ہمارا نہ تھا۔ آپ ہر تقریب پر وہی دن وہی دن کی رٹ

لگائے جا رہے ہیں۔

سالگرہ منانے والے اپنے عمل سے تو پورے طمطراق سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ برخوردار کی (بلکہ اب تو خود اپنی بھی) عمر ایک سال اور آگے بڑھ گئی ہے اور زبان سے اس دن کو وہی پہلا دن شمار کرتے ہیں۔

یہ خود فریبی کی انتہا نہیں تو اور کیا ہے؟ —

چوتھی گمراہی

عمل کی صراطِ مستقیم سے ہٹ کر گمراہ ہونے والا جس لامتناہی غلط راستوں پر چل نکلتا ہے ان میں سے ونوں کو دن مان کر ان کی روشنی میں مختلف رسوم و عادات کی پابندی کی گمراہی بھی ہے۔

نفسِ واحدہ (آدم علیہ السلام) سے پیدا ہونے والی تمام نوعِ انسانی جس طرح ایک باپ کے فرزند ہونے کی حیثیت سے ایک نوع تھی اسی طرح عقیدے کے لحاظ سے بھی اُمّتِ واحدہ تھی! اور امتِ واحدہ رہنے کے لیے آسمانی حکم کے مُطابق مامور تھی۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ اُمتِ واحدہ مختلف طبقوں، مختلف عقیدوں، مختلف رسُوم و عادات حتّٰے کہ مختلف تصورات و نظریات کی پابند بن بن کر بے شمار مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیائے کرام کی مقدس جماعت کے ہر ہر فرد نے اپنے اپنے وقت میں بار بار انہیں ایک نظریئے اور ایک ہی عقیدے پر متحد و متفق کرنے اور متحد رہنے کی کوشش کی۔ مگر یہ متحد ہو ہو کر بار بار اختلاف کرتے اور مختلف گروہوں میں تقسیم ہوتے رہے۔

اس کی وجہ انسانی شعور کی کمی یا تعلیم کا فقدان نہ تھا جیسا کہ بعض کم فہم یا کج اندیش لوگوں نے مذاہب کی تاریخ لکھتے وقت فرض کر لیا ہے کہ انسان نے عقیدے کی ابتدا

شرک سے کی ہے اور بعد میں آہستہ آہستہ تدریجی اور ارتقائی صورت میں توحید تک پہنچا ہے۔ قرآن حکیم نے اکثر مقامات پر پوری وضاحت سے بیان فرمایا ہے کہ انسان کی زندگی کا آغاز پورے شعور اور آسمانی ہدایت کے تحت ہوا ہے۔ پہلا انسان نوعِ انسانی کا باپ ہونے کے ساتھ نبی بھی تھا اس لیے اس کے زیرِ ہدایت انسانی نسل اُمتِ واحدہ کی صورت میں صحیح عقیدے پر بھی قائم رہی۔ ان میں گمراہی اس لیے نہیں آئی کہ وہ بے خبر تھے بلکہ بعض اسباب ایسے پیدا ہوتے رہے کہ جانتے بوجھتے بعض نے بعض کے حقوق میں دست اندازیاں شروع کر دیں۔ اپنی حدود سے تجاوز کر کے دوسروں کے حقوق کو پامال کیا۔ ناجائز منافع حاصل کرنا چاہا۔ اسی خرابی کو دُور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو وقتاً فوقتاً مبعوث فرمایا۔ حالات کی اصلاح فرمائی۔ حقوق و فرائض کی یاد دہانی کرائی گئی اور ایمان بالآخرۃ کی یاد کو تازہ کر کے اعمال کی جواب دہی کا بار بار یقین دلایا تاکہ احساسِ ذمہ داری نوعِ انسانی کو حیوانی زندگی سے بلند تر مقام پر رکھ کر خلافتِ ارضی کا اہل بنائے رکھے۔ قرآن حکیم نے سورۂ بقرہ کے رکوع ۲۶ میں بڑی وضاحت سے بیان فرمایا ہے:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۚ

ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلاف رُونما ہوئے) تب اللہ تعالیٰ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کج روی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رُونما ہو گئے ہیں، ان کا فیصلہ کرے۔ (اور ان اختلافات کے رُونما ہو جانے کی وجہ یہ

نہ تھی کہ ابتدا میں لوگوں کو حق بتایا نہیں گیا تھا۔ نہیں) اختلاف ان لوگوں نے کیا جنہیں حق کا علم دیا جا چکا تھا۔ انہوں نے روشن ہدایات پا لینے کے بعد محض اس لیے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔"

اس خرابی کے مختلف اسباب میں سے ایک بہت بڑا بنیادی اور عام فہم سبب یہ بھی ہے کہ انسانی نسل میں جوں جوں عددی اضافہ اور افرادی ترقی ہوئی اللہ کی یہ مخلوق زمین کے مختلف حصوں اور خطوں میں آباد ہوتی گئی۔ جن خطوں کا محلِّ وقوع، آب و ہوا، معاشی اور معاشرتی اسباب و وسائل، موسم اور موسموں سے پیدا ہونے والے مادی محرکات اور تقاضے اور ضروریاتِ زندگی یقیناً ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ ہر ہر ملک میں رہائش پذیر فرزندانِ آدمؑ اس اس ملک کی آب و ہوا کے مطابق زندگی کے تقاضے پورے کرنے کے لیے مجبور تھے۔ لہٰذا ان کی زندگی کے طور طریقے بھی لازماً ایک دوسرے سے مختلف اور علیحدہ علیحدہ ترتیب پاتے گئے۔ چنانچہ کسی سرد ملک کے باشندے کے لیے ناممکن تھا اور فی الواقع ناممکن ہے کہ وہ ایسا لباس پہنے یا پہن سکے جو لباس ایک گرم ملک کا رہنے والا پہن سکتا ہے اور پہنتا ہے ان کے سونے جاگنے، کھانے پینے، سفر و حضر، کاروبار غرض زندگی کے تمام تر عام طور طریقے ایک دوسرے سے ناگزیر مختلف ہوتے گئے اور ہو گئے اور روزمرّہ کے تمام معمولات بالکل علیحدہ علیحدہ ترتیب پا گئے جنہیں چھوڑنا ان کے لیے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

اس نفس الامری حقیقت کا تجربہ ایک ہی ملک میں رہنے والا کوئی شخص سردی اور گرمی کے ہر دو موسموں کے عام معمولات پر غور کر کے خود اپنی ہی زندگی میں کر سکتا ہے سردی کا موسم ہے آپ کسی مہمان کو صبح وداع کرتے وقت بار بار کہیں گے آپ اتنی جلدی نہ کریں ذرا دھوپ نکلنے دیں۔ بڑی سردی ہے۔ دیکھیں باہر برف جمی ہوئی ہے، ..... وغیرہ وغیرہ لیکن یہی صورت اگر گرمی کے موسم میں پیش آتے تو آپ مہمان تو کیا

ایک طرف گھر والوں کو بھی بار بار کہیں گے کہ ناشتہ جلدی تیار کرو۔ مہمان عزیز کو دھوپ نکلنے سے پہلے جانا ہے ...... گویا ضروریاتِ زندگی اور معمولاتِ روزمرہ تو رہے ایک طرف موسم کی تبدیلی ایک ہی ملک کے رہنے والوں کے لب ولہجہ اور اندازِ کلام تک کو بھی تبدیل کر دیتی ہے۔

یہی وہ عادات اور رسوم و رواج ہیں۔ جنھوں نے ایک باپ کے بیٹوں کو مختلف اور علیحدہ علیحدہ طرز ہائے زندگی کا خوگر بنا دیا۔ یہاں تک کہ اپنے اپنے مورثِ اعلےٰ کے ناموں پر قبیلے بھی علیحدہ علیحدہ بن گئے۔ چنانچہ ایک باپ (آدم ؑ) کے فرزند اس طرح مختلف طبقوں، مختلف فرقوں بلکہ مختلف نسلوں میں تقسیم ہوتے رہے اور تقسیم ہو گئے عربی و عجمی، رومی و شامی، ایرانی و تورانی کے امتیازات تمام اسی بے بنیاد سبب کی پیداوار ہیں — گویا خدائے واحد کو انبیائے کرام کی ہدایت کے مطابق ساری کائنات کا خالق و حاکم مان لینے کی بنیاد پر جس طرح ساری نسلِ آدم ملتِ واحدہ کی صورت اختیار کرتی ہے اور اسے ایسا کرنا چاہیئے بالکل اسی طرح اس کے مقابلہ میں مختلف ملکوں اور وطنوں کی آب و ہوا اور اس آب و ہوا سے پیدا ہونے والے رسوم و رواج و مادی اسباب ہر ہر ملک میں صرف ایک ایک تازہ خدا ہی نہیں بلکہ ہر آن تازہ بتازہ کئی کئی خداؤں کو جنم دیتے رہتے ہیں جن کی نمود و نمائش اور جن کا عملی ظہور ملتِ واحدہ کے متحد مقدس نظریاتی تصور و یقین کو ایمان کی روشنی میں نمایاں کرنے کے بجائے کفر و انکار کی تاریکیوں میں دفن کرتے رہتے ہیں۔ اقبال مرحوم نے درست کہا ہے:۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ ملت کا کفن ہے

راہِ حق کی ایک مستقل رکاوٹ (ملکی، قومی اور خاندانی رسم و رواج)

ہر پیغمبر کی دعوتِ حق اور اعلانِ توحید کے جواب میں جس دعوت کا مقصدِ وحید اور

نصب العین صرف اور صرف یہ ہے کہ نوعِ انسانی کو ایک مرکزی عقیدے اور ایک عقلی نظریے پر متحد کیا جائے اور متحد رکھا جائے۔ ہمیشہ منکر قوموں نے یہی جواب دیا ہے کہ:

قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۔ ہمارے لیے وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے

گویا دعوتِ حق کے بخطِ مستقیم مخالف سمت سے ٹکر لینے والی کارفرما قوت ہمیشہ ملکی قومی اور خاندانی رسم و رواج کی قوت ہی رہی ہے ۔۔۔ بڑے بڑے نکتہ وَر، دانش مندوں اور صاحبِ خرد سخن وروں نے عقل کا نام لے لے کر اس اندھی تقلید کی حماقت اور بے عقلی کو فخر کے ساتھ آزمایا ہے۔ بلبلِ شیراز نے ملک کی آب و ہوا اور موسم کے سحر آفرین اثر ہی سے متاثر ہو کر کس پُر غرور اور اعتماد آفرین لب و لہجہ میں صاف کہا ہے جس میں موسم کی تحریک کو نہ قبول کرنا خلافِ عقل قرار دیا ہے: ؎

حاشا کہ من بر موسمِ گل ترکِ مے کنم
من لافِ عقل مے زنم ایں کار کے کنم

"بخدا! یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ موسمِ بہار ہو اور میں شراب ترک کر دوں، آخر میں عقل کا دعوے دار ہوں ایسا کیوں کروں؟"

گویا موسم کے اثر سے پیدا ہونے والی تحریک کے اثر کو قبول کرنا نہیں، نہ قبول کرنا احمقانہ فعل ہے۔ فرماتے ہیں:-

صبح است و ژالہ مے چکد از ابرِ بہمنی
برگِ صبوح سازو بزن جامِ یک منی

"صبح ہو گئی ہے اور ماہ بہمن کے ابرِ بہار سے بارش کے قطرے گر رہے ہیں۔ صبوحی (صبح کی شراب) کا سامان کرو اور سیروں سیر شراب کے ساغر لنڈھاؤ۔"

ایک دستورِ مُستمرّہ اور قاعدہ کلّیہ کی صورت میں کس وثوق سے ارشاد ہوتا ہے ، ؎

صبح است و موسمِ گُل ساقی بیار بادہ
ہنگامِ گل کہ دیدست بے مے قدح نہادہ

"صبح کا وقت ہے اور موسمِ گُل بھی، اے ساقی شراب لاؤ! موسمِ بہار میں کہیں شراب سے خالی پڑا بھی ساغر دیکھا گیا ہے؟"

اور پھر دیکھئے کسی ہوش مند نے اس ساغر گیری اور نوشانوش کے شوق کی بدمستی اور بے خودی میں بھی باہوش اور ہوشیار رہنے کی کس عقل مندی سے تاکید کی ہے۔ کہا ہے : ؎

پیالہ گیر و ز دستِ خضر بہوش بگیر
مبادا آبِ حیاتت دہد بجائے شراب

"ساغر لیتا جا! لیکن اگر سوءِ اتفاق سے خضر کے ہاتھ سے ساغر لینا پڑ گیا ہے تو ہوش سے لینا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ شراب کے بجائے تجھے آبِ حیات دے دے۔"

سو اس سلسلے میں دنیا کے بدمستانِ شرابِ غفلت نے ہمیشہ پوری احتیاط سے کام لیا ہے کہ خضر صفت سچے راہنماؤں کے ہاتھ سے ابدی زندگی بخشنے والے آبِ حیات کا پیالہ نہ لے لیں بلکہ اس کے مقابلے میں انہی رسوم و آداب کی پیروی کو پسند کیا اور کیے رکھا ہو ملک و قوم اور آباؤ اجداد کے کسی ملک کی آب و ہوا اور موسم کے عادی محرکات کے تاثر میں قبول کر رکھے تھے۔

(عاد کی قوم نے اپنے بھائی ہود پیغمبر کو اس کی دعوتِ حق اور اس کے قبول پر خدا کی طرف سے رحمتوں کی بشارتوں کے باوجود صاف جواب دیا کہ :۔

قَالُوا يٰهُوۡدُ مَا جِئۡتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحۡنُ بِتَارِكِىۡۤ اٰلِهَتِنَا عَنۡ قَوۡلِكَ وَمَا نَحۡنُ لَكَ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ۝

"وہ لگے کہنے ہود! تو ہمارے پاس کوئی دلیل لے کر تو آیا نہیں اور تیرے

کہنے سے ہم اپنے معبودوں کو
چھوڑنے والے نہیں اور نہ ہم
تجھ پر ایمان لانے والے ہیں"

دعوتِ حق اور پیغمبرِ وقت کی پیروی کے مقابلے میں ہمیشہ ان لوگوں نے آباؤ اجداد کے اختیار کردہ رسوم و آداب ہی کو مقدم اور ضروری سمجھا ہے اگرچہ ان کے یہ آباؤ اجداد جن کی وہ پیروی کر رہے ہیں خود بے خبر اور گمراہ ہوں۔

واذا قيل لهم تعالوا الى ما انزل الله والى الرسول قالوا حسبنا ما وجدنا عليه اباءنا ۔ اولو كان اباؤهم لا يعلمون شيئا ولا يهتدون ۝

"اور جب ان (لوگوں) سے کہا جاتا ہے کہ جو (قرآن) اللہ نے اتارا ہے اس کی اور رسولِ (خدا) کی طرف چلو (اور جو حکم وہ دیں مانو تو اس کے جواب میں) کہتے (کیا) ہیں کہ جس (طریقے) پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو چلتے ہوئے) پایا ہے (وہی طریقہ) ہمارے لیے بس کرتا ہے۔ (یہ لوگ اسی پرانی لکیر کے فقیر رہیں گے) اگرچہ ان کے باپ (دادا) کچھ نہ جانتے اور نہ راہِ راست پر رہے ہوں"

یہاں تک کہ صریح فحش حرکات سے بھی نہیں جھجکتے بلکہ اپنی ان فحش حرکات اور بُرے اعمال کو خدا کا حکم کہہ دینے سے بھی نہیں شرماتے۔

واذا فعلوا فاحشة قالوا وجدنا عليها اباءنا والله امرنا بها ۔ قل ان الله لا يامر بالفحشاء ۔ اتقولون على الله ما لا تعلمون ۝

"اور (ایسے گستاخ ہیں کہ) جب کسی بے جا حرکت کے مرتکب ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بڑوں کو اسی (طریقے) پر (چلتے) پایا۔ اور اللہ نے ہم کو اس کی اجازت

دی ہے (اے پیغمبر ان لوگوں سے)
کہو کہ اللہ تو بے جا کام کی اجازت
دیتا نہیں آیا تم لوگ بے (سوچے) سمجھے اللہ پر جھوٹ بولتے ہو؟"

بے ہودگیوں اور بدرسمیوں کا اصل سبب

اس ضمن میں سورۂ بقرہ کے رکوع ۲۶ کی آیت
كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً تا بَغْيًا بَيْنَهُمْ ج

ایک مرتبہ پھر پڑھ لیں جو پیچھے گذر چکی ہے۔ اس آیت کے الفاظ بَغْيًا بَيْنَهُمْ میں معاشری معاشی، تمدنی اور ایسی ہر قسم کی اخلاقی بدعنوانیوں کے بنیادی سبب کی طرف مکمل اشارہ کر دیا گیا ہے۔ یہاں اسی مضمون کو ذرا تفصیل سے لکھا جا رہا ہے۔

انسانی معاشرے میں جب آسمانی احکام کو فراموش کر کے ایک دوسرے کے حقوق میں تجاوز شروع ہو جاتی ہے تو عام معاشری عدم توازن ناگزیر ہو جاتا ہے، انسان حیوانی سطح پر اتر آتا ہے۔ خدا کے تشریعی قانون کی پابندی ہی شرفِ انسانی کی اصل بنیاد ہے جب یہ پابندی ہی نہ رہی تو انسانی شرف و مجد کا سوال ہی سرے سے ختم ہو گیا۔ ہر شخص دوسرے کے مال جان، عزت و آبرو، اثر و رسوخ، عیش آرام، غرض زندگی کی ہر ضرورت اور ہر کارآمد سرمائے کا استحصال کرنے کی کوشش کرے گا اور اس معاملہ میں قانون سے بے نیاز ہو کر حیوانوں کی طرح اپنے آپ کو آزاد سمجھے گا۔ جنگل کا قانون ہو گا جس کی لاٹھی اس کی بھینس طاقتور جو چاہے گا کرے گا اور کمزور ہر ظلم برداشت کرے گا۔ شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم نے اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں ان بدرسمیوں کے کسی معاشرے میں پیدا ہو جانے کی وجہ بیان فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ:

شاہ ولی اللہ کا بیان دربارہ رسوم | بُرے رسوم پیدا ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ

کبھی ایسے لوگ معاشرے میں با اختیار سربراہ بن جاتے ہیں جن پر جزئی رائیں اور ذاتی اغراض غالب ہوتی ہیں اور مصالح کلّیہ یعنی اجتماعی منافع سے ان کے ذہن ناآشنا اور دل خالی ہوتے ہیں۔ وہ درندوں کے سے کام کرنے لگتے ہیں جیسے رہزنی اور غصب و غارت وغیرہ یا ان سے شہوت پرستی کے کام سرزد ہوتے ہیں جیسے لواطت اور مردوں کا زنانہ پن وغیرہ یا ضرر رساں پیشے اختیار کرتے ہیں جیسے سود خوری، ناپ تول میں کمی، یا لباس اور شادی وغیرہ کی دعوتوں میں ایسے طریقے اختیار کر لیتے ہیں جن کا انجام اسراف ہوتا ہے اور ان کے مہیّا کرنے میں بڑے اہتمام کی ضرورت پڑتی ہے۔ یا تفریح کے سلسلے میں اپنے شوق بڑھاتے ہیں جن کے سبب سے امور معاش و معاد معطّل ہو جاتے ہیں جیسے گانا بجانا، کبوتر بازی، شطرنج وغیرہ۔ یا مسافروں پر پُرمشقت محصول مقرر کرتے ہیں اور عوام رعایا سے ایسے ٹیکس وصول کرتے ہیں جس سے وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ یا باہم حرص و بُغض بڑھا لیتے ہیں پس ان کو خود تو یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں سے حقارت آمیز برتاؤ کریں لیکن اس کو ناپسند کرتے ہیں کہ دوسرے لوگ ان سے ایسا معاملہ کریں۔ ان کی وجاہت اور دبدبہ کی وجہ سے کوئی ان کو بُرا نہیں کہہ سکتا۔

اس کے بعد ان حالات کے نتیجہ میں فاسق و فاجر لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ان با اقتدار لوگوں کی پیروی کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور ان بدعنوانیوں کے رواج و اشاعت میں بڑی کوشش کرتے ہیں اور پھر اس کے بعد معاشرے میں ایک ایسی قوم سامنے آتی ہے جن کے دلوں میں نہ نیک کاموں کا کوئی میلان ہوتا ہے نہ اعمال فاسدہ سے کوئی نفرت۔ پس اپنے رؤساء کی حالت دیکھ دیکھ کر ان میں بھی انہی امور کی آمادگی پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی ان کو نیک باتوں کا پتہ ہی نہیں چلتا۔

ایسے خاندانوں کے آخر میں کچھ لوگ ایسے بھی باقی رہتے ہیں جن کی فطرتیں درست ہوتی ہیں۔ وہ ان بڑے لوگوں سے میل جول نہیں رکھتے اور غصہ کی حالت میں خاموش رہتے

ہیں پس ان کی خاموشی سے بری رسمیں قائم اور مستحکم ہو جاتی ہیں۔ . . . ."

کامل العقل لوگوں کا فرض ہے کہ حق کے پھیلانے اور جاری کرنے میں اور باطل کے مٹانے اور نابود کرنے میں پوری کوشش کریں۔ لیکن بسا اوقات یہ کوشش جھگڑوں اور لڑائیوں کے بغیر بارور نہیں ہوتی۔ پس اس وقت یہ لڑائی جھگڑے تمام نیک کاموں میں افضل شمار ہوں گے اور جب دنیا میں نیک روی کا طریقہ قائم ہو جائے گا۔ تو ہر زمانہ میں لوگ اس کو تسلیم کریں گے کہ اسی طریقہ پر ان کی زندگی اور موت ہونے لگے اور اسی پر ان کے نقوش اور تصورات جم جائیں اور وہ اس طریقہ کو نفیاً و اثباتاً اور وجوداً و عدماً زندگی کا دستور بنا لیں تو پھر کوئی اس سے باہر نہ ہو سکے گا۔ سوائے اس شخص کے جس کا نفس ناپاک ہو، کم عقل ہو، شہوت اس پر غالب ہو اور اس کی گردن پر نفس پرستی سوار ہو۔ پس جب وہ اس طریقہ سے باہر قدم رکھے گا، تو اپنے دل میں گنہ گار ہونے کی شہادت کو پائے گا۔ مصلحت کلی اور اس کے درمیان ایک پردہ حائل ہو جائے گا اور جب وہ بے باکانہ طور پر کوئی کام کرے گا تو یہی کام اس مرض نفسانی کی خود شرح بن جائے گا۔ یعنی اس کے نفسانی مرض کی کیفیت صاف صاف معلوم ہو جائے گی اور یہ اس کے دین پر نمایاں داغ نظر آئے گا — پس یہ نیک طریقہ جب پورا پورا کامل اور مقرر ہو جاتا ہے تو ملاء اعلیٰ سے اس طریقہ کے موافقین کے لیے دعا اور مخالفین کے لیے بددعا اور تفریق صادر ہوتی ہے۔

جب ان طریقوں کی یہ صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ تو وہ اس فطرت سے شمار کیے جاتے ہیں جن پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ واللہ اعلم۔"

(تلخیص و ترجمہ از حجۃ اللہ البالغہ)

قرآن حکیم نے سورۃ زخرف کے شروع میں ہر دور کے کھاتے پیتے منکرین حق لوگوں کی ایسی ہی چند معاشرتی اور اعتقادی بدعقیدگیوں اور بدعنوانیوں کا ذکر کر کے ان تمام خرابیوں کا اصل سبب وقت کے ان ہی آسودہ حال لوگوں کی فراخ رولیوں اور آوارگیوں کو قرار دیا ہے

اور پھر لطف یہ کہ ان خرابیوں کے موجد تو خود ہیں لیکن ذمہ دار گردانتے ہیں اپنے آباؤ اجداد کو۔ تاہم اپنی بد اعمالیوں پر ایسے مُصر اور بضد ہیں کہ زندگی کا بہترین نظام بلکہ پیغمبرؑ کا اُسوۂ حسنہ سامنے آجانے پر بھی اپنے بُرے آباؤ اجداد کے بُرے افعال کی اندھی تقلید کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ یہاں تک کہ عذاب الٰہی میں گرفتار ہو کر اپنے بُرے انجام تک پہنچ جاتے ہیں۔

وَكَذٰلِكَ مَآ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَآ إِنَّا وَجَدْنَآ آبَآءَنَا عَلَىٰٓ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰٓ آثَارِهِمْ مُّقْتَدُونَ ۝ قٰلَ أَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِأَهْدَىٰ مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ آبَآءَكُمْ ۖ قَالُوٓا إِنَّا بِمَآ أُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُونَ ۝ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۖ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ۝

"اور (اے پیغمبر!) اسی طرح ہم نے تم سے پہلے جب کبھی کسی گاؤں میں کوئی (پیغمبر) ڈر سنانے والا بھیجا وہاں کے آسودہ حال لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقے پر پایا اور ان ہی کے قدم بہ قدم ہم (بھی ان کی) پیروی کر رہے ہیں (اس پر اُن کے پیغمبر نے) کہ جس (طریقے) پر تم نے اپنے باپ دادوں کو پایا۔ اگر میں اس سے کہیں سیدھا رستہ (یعنی دین حق) لے کر تمہارے پاس آیا ہوں تو بھی (تم اسی پرانے طریقے پر چلے جاؤ گے) وہ بولے (کچھ بھی ہو) جو (دین) تم کو دے کر بھیجا گیا ہے ہم تو اس کے ماننے والے نہیں۔ آخر کار ہم نے ان سے (ان کی سرکشی کا) بدلہ لیا تو (اے پیغمبر!) دیکھو کہ (پیغمبروں کے) جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔"

اسی طرح دعوتِ حق کے انکار، احکامِ الٰہی کی نافرمانیوں اور فسق و فجور کی بدرسمیوں کے مرتکب اور عذابِ خداوندی کی بدانجامیوں کے سزاوار ہمیشہ وہی کھاتے پیتے اور مقتدر لوگ ہی ہوئے اور ہوتے رہے ہیں۔

وَإِذَآ أَرَدْنَآ أَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً

اور جب ہم کو کسی گاؤں کا ہلاک

اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا۝

کرنا منظور ہوتا ہے۔ ہم اس کے خوش حال لوگوں کو کوئی سا بھی حکم دیتے ہیں پھر وہ اس (بستی) میں نافرمانیاں کر چلتے ہیں پھر وہ بستی حکم (عذاب) کی مستحق ہو جاتی ہے۔ پھر ہم اس بستی کو مار کر تباہ کر دیتے ہیں۔"

ایک گناہ دوسرے گناہوں کا سبب بنتا چلا جاتا ہے

اوپر لکھی ہوئی سورۃ اعراف کی آیت "فاذا فعلوا فاحشۃ" الآیہ پر غور کرو کہ گناہوں کے موجد، رواج دینے والے اور پھر ان پر اصرار کرنے والے تو یہ کھاتے پیتے، معاشرے میں مقتدر، متغلب اور مترفین خود ہیں لیکن اپنے فحش فعل اور ناپاک حرکت کا ذمہ دار گردانتے ہیں اپنے آباؤ اجداد کو۔ بلکہ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ "واللہ امرنا بھا (خود اللہ نے ہم کو اس فعل بد کی اجازت دے رکھی ہے۔) اعاذنا اللہ — یہ عموماً انسان کی عادت میں شامل ہے کہ اپنی ذات کے حق میں کسی عیب کو قبول کرنا حتے الامکان پسند نہیں کرتا۔ چور کو چور کہلانا جھوٹ بولنے والے کو جھوٹا کہلانا بے وقوف کو بے وقوف کہلانا کسی صورت گوارا نہیں ہوتا۔ ایک پیشہ ور چور جس کا ذریعۂ معاش ہی چوری کے سوا کوئی نہیں، مار مار کر اس کی چمڑی اُدھیڑ دو، چوری کے الزام کو قبول نہیں کرے گا یہی وجہ ہے کہ انسان ہمیشہ اپنا گناہ دوسروں کے سر تھوپنا پسند کرتا ہے۔ اس سلسلے میں باپ دادا تو ہے ایک طرف خدا کی ہر عیب سے پاک ذات کو بھی ملوث کرنا پسند کر لیتا ہے اور خود گناہ کے عیب اور الزام سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ کسی بدانجام فعل کی سزا میں مبتلا مجرم شخص سے بات کر کے دیکھو بلا تکلف کہہ دے گا کہ "خدا کو ایسا ہی منظور تھا۔" گویا یہ فعل بد اس سے خدا نے کرایا ہے اس کا اپنا کوئی قصور نہیں۔

کتا خسیس ترین حیوان اور ناپاک جانور ہے۔ سڑے بسے مُردار بلکہ پاخانے تک کو کھا جاتا ہے لیکن خود پیشاب کرنے وقت کسی دیوار کا صاف ستھرا کونہ تلاش کرتا ہے اور ایک ٹانگ اٹھا کر ایسی احتیاط سے مُوتنے کی کوشش کرتا ہے کہ بدن پر پیشاب کی کوئی چھینٹ نہ پڑ جائے۔ یہ ایک نجاست خور حیوان کا حال ہے۔ انسان اس سلسلے میں کیا کچھ نہ کریگا؟

عذرِ گناہ

یہ عذرِ گناہ کی وہ کیفیت ہے جہاں انسان اصل گناہ سے کہیں بڑھ کر بڑے بڑے گناہوں کے لامتناہی سلسلہ میں گرفتار ہو جاتا ہے اور ہوتا چلا جاتا ہے۔

اب اس سلسلہ پر ذرا نگاہِ واپسیں ڈال لیجئے تاکہ آگے آنے والے مباحث سے ذہنی رابطہ قائم ہو جائے اور فہمِ مطالب میں سہولت حاصل ہو جائے۔

گزشتہ مباحث کا خلاصہ

۱۔ لغت کی وضاحت جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "تقریب" کو خاص معیّن دنوں اور تہواروں کے معنوں میں استعمال کرنا محض عام اصطلاح تو ہو سکتا ہے، لغت نہیں۔ جس سے کسی دن اور تاریخ کو کوئی معنوی حیثیت حاصل ہو سکے۔

۲۔ خود وقت ایک ایسی شے ہے جس کا وجود عمل کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ لہذا قابلِ اعتماد اور قابلِ توجہ عمل ہے۔ وقت اور کوئی دن یا تاریخ نہیں۔

۳۔ اصل چیز جو عمل ہے اسے کسی خاص دن اور تہوار کے مقابلے میں ثانوی درجہ دے کر اور عمل کی اہمیت کو نظر انداز کر کے جو لوگ تہواروں کا اہتمام کرتے ہیں۔ وہ فی الحقیقت اپنے عمل کی دنیا کو لامتناہی گمراہیوں میں کھو دیتے ہیں۔

۴۔ ایک بدیہی حقیقت کی وضاحت کہ کوئی دن، دن ہونے کی حیثیت سے نہ سعد ہے

نہ نحس، نحوست اور برکت صرف عمل سے وابستہ اور عمل ہی پر منحصر ہے۔ اس حقیقت پر انسانی تاریخ کے چھوٹے سے چھوٹے واقعات سے لے کر بڑے سے بڑے ناقابل فراموش حادثات شاہد ہیں جس شہادت سے کسی دشمن اور دوست کو انکار کی گنجائش نہیں۔

۵۔ صرف دنوں کے سعد و نحس مان لینے اور موسموں کی مادی تحریک کے تاثر کا غلط عقیدہ ہی ایسی لامتناہی گمراہیوں کا باعث بن گیا ہے۔ جن گمراہیوں نے ایک باپ کے فرزندوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا۔ اور امتِ واحدہ اور خلافتِ الٰہیہ کے بلند مقام سے گرا کر ذاتوں، نسلوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا۔ اور ایک خدا کی قابلِ فخر اطاعت کے بجائے اپنے ہم جنسوں کا غلام بنا دیا۔ امتِ واحدہ امتِ واحدہ نہ رہی۔ چنانچہ دنوں اور موسموں کی بنا پر پیدا ہونے والے رسوم و رواج آپ ہی حق کی راہ میں ایک مستقل رکاوٹ بن گئے، ہمیشہ بنتے رہے اور بنتے جا رہے ہیں۔

۶۔ اس خدا فراموشی اور رسوم یا نسل پرستی کی لاقانونی نے ایسے لوگ پیدا کیے جنہوں نے ہوائے نفس کے تحت بدرسمیاں پیدا تو خود کیں لیکن بدنام اپنے آباؤ اجداد کو کیا۔ یا بالفاظِ دیگر اپنے نیک آباؤ اجداد کو چھوڑ کر ان بداعمال باپ دادوں کی بدعملیوں کا سہارا لیا۔ جو واقعی ان بدرسمیوں اور گمراہیوں کے موجد تھے (تفصیل آئندہ اوراق میں بھی آئے گی)

۷۔ دنوں کی پرستش سے پیدا ہونے والی یہ گمراہی جب آبائی رسوم و روایات کا درجہ اختیار کر گئی تو اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ فواحش و منکرات تک میں نعوذ باللہ خدا کو بھی شریک گردان لیا گیا۔ اور ان فواحش کو خدا کا حکم قرار دینے سے بھی نہ شرمائے اور کہہ دیا: "وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا۔"

مزید ضروری وضاحت

وقت کی حقیقت (۱) وقت کا لفظ چونکہ اس ساری بحث اور اس زیر بحث مسئلہ کے تمام پہلوؤں میں ایک بنیادی سوال کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے اس پر کچھ زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ اس سوال کے مناسب حل پر اصل مسئلہ سمجھنے میں زیادہ سے زیادہ سہولت پیدا ہو سکے۔

قرآن حکیم نے اس سلسلہ میں لوگوں کے سوال کرنے پر جواب میں ارشاد فرمایا:۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ

اے پیغمبر! لوگ تجھ سے چاند کی گھٹتی بڑھتی صورتوں کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہو یہ لوگوں کے لیے تاریخوں کے تعین اور حج کی علامتیں ہیں۔

جس طرح ساری دنیا کے مختلف خطوں میں آباد لوگ اپنے اپنے ملک کی آب و ہوا سے متاثر مختلف دنوں، تاریخوں اور تہواروں کے قائل بلکہ پرستار تھے اور اس سلسلہ میں اجرام سماوی سے متاثر بھی تھے اور پھر خود اجرام سماوی کو بھی بعض حالات سے متاثر مانتے تھے۔ خدا قادر مطلق کی اصل قوت کے اثر سے غافل ہو کر جہاں ہر ادنیٰ مادی قوت کے سامنے سرنگوں ہو جاتے وہاں موسم سرما کے چھوٹے دنوں میں سورج دیوتا جیسے سب سے بڑے آسمانی جرم کو بھی ہر روز مسلسل کم ہوتے جانے والی بے نوری کی وجہ سے کسی پاداش عمل کی مصیبت میں مبتلا سمجھتے اور جس دن پہلی مرتبہ اُسے نسبتاً کچھ زیادہ وقت چمکنے کا موقع ملتا، اس دن کو "نوروز" کا نام دے کر سورج دیوتا کا جنم دن مناتے اور سمجھتے کہ آج دیوتا مصیبت سے آزاد ہوا ہے۔ بالکل اسی طرح عرب کے لوگ بھی ان عام توہم پرستیوں میں مُبتلا تھے۔ چاند کی گھٹتی بڑھتی صورتوں کے متعلق بھی ان کے ایسے ہی غیر متناہی مختلف تصورات

تھے۔ رات دن کی ہر نئی ساعت اور نئی صورت سے ایک نیا شگون لیتے۔ جن میں دنوں تاریخوں اور ساعتوں کے سعد و نحس کا بے بنیاد تصور ہر جگہ سر فہرست ہوتا۔

خواجہ حافظ شیرازی اپنی وارداتِ ہجر و وصال کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

دی شب میانِ زلف بدیدم رُخِ نگار
بر ہیئتے کہ ابرِ محیط قمر شود!

(میں نے کل رات معشوق کے رُخِ روشن کو زلفِ پریشان میں ایسا گھرے ہوئے دیکھا جس طرح سیاہ بادل کی لکیریں چاند کے سامنے آ گئی ہوں۔)

گفتم کہ ابتداء کنم از بوسہ گفت نے
بگذار تا کہ ماہ ز عقرب بدر شود!

(میں نے کہا لُطفِ وصل حاصل کرنے کی ابتدا، بوس و کنار سے ہونی چاہیئے محبوب نے کہا ذرا ٹھہرو۔ چاند کو بُرجِ عقرب سے نکل جانے دو (یعنی زلفوں کے بکھرے ہوئے بال درست کر لوں)

نجوم کے قواعد سے واقف شاعر کی اس تلمیح سے پورا لطف اٹھا سکتے ہیں تاہم اتنا سمجھ لیجئے کہ علمِ نجوم کے مطابق آسمان کے بارہ بُرجوں میں سے جو حمل و ثور سے شروع ہُوا، دلو و حُوت پر ختم ہوتے ہیں۔ چاند تیس یا انتیس دنوں میں ان بروج میں سے شروع ہو کر نکلتا ہے۔ برج عقرب بھی ان ہی میں سے ایک برج ہے، جسے چاند کے زوال کی منزل سمجھا جاتا ہے اور ایسے وقت میں کسی مبارک کام کا کرنا مناسب خیال نہیں کیا جاتا! اب رُخِ محبوب کی تشبیہ چاند سے اور زلفِ سیاہ کی عقرب (بچھّو کی دُم) سے اور پھر چاند کے بُرجِ عقرب میں ہونے کی نحوست اور اس نحوست سے بچنے کی ناز آفرین معشوقانہ کوشش اور پیش کش؛ ان وارداتِ وصل و ہجر کا کچھ نہ کچھ لطف اٹھا سکتے ہو۔

القصہ عرب کے وہم پرست اور اب کے ہدایت طلب لوگوں (صحابہ کی جماعت) کا چاند کے متعلق یہ سوال کرنا ایک قدرتی امر اور طبعی تقاضا تھا۔ چنانچہ کائنات کے خالق قادر مطلق نے ساری دنیا کے سچے راہنما کو حکم دیا کہ انہیں کہہ دو کہ چاند کی کمی بیشی کسی سعد و نحس ساعت کے اثر سے نہیں بلکہ یہ صورت حال خود وقت اور وقت کی کمی بیشی کے تشخص کی علامت بنائی گئی ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات اچھی طرح یاد رکھ لینی چاہیئے اور کسی وقت نظر سے اوجھل نہ ہونی چاہیئے کہ قانون قدرت کے ازلی نظام نے ابتدائے آفرینش ہی سے نظام شمسی کو قطعاً نظر انداز رکھا ہے اور قمری حساب پر انحصار کیا ہے جس میں بے شمار حکمتوں کے علاوہ سب سے بڑی حکمت یہ ہے کہ سورج کا نظام ایک ہی حالت میں رہتا ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ہر ملک کے لوگ اپنے اپنے ملک کی آب و ہوا کے تحت ایک دوسرے سے مختلف اپنی زندگی کے دستور خود تجویز کر کے ان پر جم جاتے ہیں اور ان اختیار کردہ طور طریقوں سے کوئی شے انہیں علیحدہ نہیں کر سکتی جس کا نتیجہ نوع انسانی میں ایک مستقل انتشار اور تفریق کی صورت میں نمودار ہوتا اور ہو جاتا ہے۔ ہر ملک کے باشندوں کو من مانیاں کرنے کا موقع ملتا ہے اور امتِ واحدہ بے شمار مختلف شعوب و قبائل میں تقسیم ہو جاتی ہے حتیٰ کہ ان کے دینی نظریات و عقاید بھی وحدتِ فکر کے بجائے کثرتِ افکار میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اور وہ مقصد فوت ہو جاتا ہے جو انسان کی خلافتِ الٰہیہ میں مضمر تھا۔ فرشتوں کا مسجود اور خدا کی ساری مخلوق کا مخدوم فرزندِ آدم خود رسوم کا پابند ہو کر دلوں کا محتاج اور پرستار بن جاتا ہے۔

اسلام کا رُخ تمام اقوامِ عالم کی طرف ہے۔ چاند کی شکلوں میں ہر دم تغیر ہوتا رہتا ہے۔ ہر تعلیم یافتہ اور جاہل اس فرق کو دیکھ کر اوقات معین کر سکتا ہے اور خود وقت کو اپنی اوقات اور حیثیت بھی نہیں بھول سکتی کہ وہ بذاتِ خود کسی مستقل وجود کا مالک

نہیں۔ چاند کی حالت کے یہی تغیرات ضبطِ اوقات کا کام دیں گے اور ہر عام سمجھ کا آدمی بادنیٰ تامل یہ حقیقت معلوم کر لے گا کہ چاند کے تغیرات بھی چاند کے اپنے بس میں نہیں حتّٰی کہ سورج جس سے چاند روشنی حاصل کرتا ہے وہ بھی خود مجبور ہے۔

چنانچہ اُمتِ مُسلمہ کے مؤسس اول حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قمری حساب کے مطابق ہی حج کے دن مقرر کیے۔

شمسی حساب کے مطابق حج کے جو اوقات مقرر ہو جاتے وہی رہتے، اگر ایک ملک کے لوگ اس دوام کی وجہ سے بہ لحاظ موسم آرام میں ہوتے تو دوسرے ہمیشہ مصیبت میں مبتلا رہتے۔

یہی وہ نظام ہے جس کے متعلق قرآن حکیم نے وضاحت کی ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق اور آفرینش کائنات کے وقت سے یہی نظام ترتیب دیا گیا اور وقت کے پیغمبر نے اسی نظام کی تجدید اور پابندی کی ہے اور کرائی ہے۔ بلکہ قرآن حکیم نے اس قمری نظام کے خلاف عمل کرنے اور اسے توڑ کر موسمی اثرات کے تحت کوئی نظام ترتیب دینے کو کفر ہی نہیں بلکہ کفر میں مزید اضافہ قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو سورۂ توبہ کی حسب ذیل آیات:-

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڏ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَاۗفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَاۗفَّةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ اِنَّمَا النَّسِيْۗءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِـــُٔـوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ۭ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْۗءُ اَعْمَالِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

حقیقت یہ ہے کہ مہینوں کی تعداد جب سے اللہ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے، اللہ کے نوشتے میں بارہ ہی ہے اور ان میں سے چار مہینے حرام ہیں۔ یہی ٹھیک ضابطہ دین قیّم ہے۔ لہٰذا ان چار مہینوں میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو اور مشرکوں سے سب مل کر لڑو جس طرح وہ سب مل کر

تم سے لڑتے ہیں اور جان رکھو کہ اللہ متقیوں ہی کے ساتھ ہے۔ نسی تو کفر میں ایک مزید کافرانہ حرکت ہے جس سے یہ کافرانہ گمراہی میں مبتلا کیے جاتے ہیں کسی سال ایک مہینے کو حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال اس کو حرام کر دیتے ہیں۔ تاکہ اللہ کے حرام کیے ہوئے مہینوں کی تعداد پوری بھی کر دیں اور اللہ کا حرام کیا ہوا حلال بھی کر لیں۔ ان کے بُرے اعمال اُن کے لیے خوشنما بنا دیے گئے ہیں اور اللہ منکرین حق کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔"

عرب میں نسی دو طرح کی تھی اس کی ایک صورت تو یہ تھی کہ جنگ و جدل اور غارت گری اور خون کے انتقام لینے کی خاطر کسی حرام مہینے کو حلال قرار دے لیتے تھے اور اس کے بدلے میں کسی حلال مہینے کو حرام کر کے مہینوں کی تعداد پوری کر دیتے تھے۔

دوسری صورت یہ تھی کہ قمری سال کو شمسی سال کے مطابق کرنے کے لیے اس میں "کبیسہ" کا ایک مہینہ بڑھا دیتے تھے تاکہ حج ہمیشہ ایک ہی موسم میں آتا رہے اور وہ ان زحمتوں سے بچ جائیں جو قمری حساب کے مطابق مختلف موسموں میں حج کے گردش کرتے رہنے سے پیش آتی ہیں۔ اس طرح ۳۳ سال تک حج اپنے اصل وقت کے بجائے دوسری تاریخوں میں ہوتا رہتا تھا اور صرف چونتیسواں سال ایک مرتبہ اصل ذی الحجہ کی ۹۔۱۰ تاریخ کو ادا ہوتا تھا یہی وہ بات ہے جو حجۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ میں فرمائی تھی۔ کہ:

ان الزمان قد استدار کھیئتہ — زمانہ پھر پھرا کر اُس مقام پر آگیا جس
یوم خلق السموات والارض — دن اللہ نے زمین و آسمان کو پیدا
کیا تھا۔

یہ قدرتی اتفاق تھا کہ اس سال (یعنی حجۃ الوداع کا سال) حج کا وقت گردش کرتا ہوا ٹھیک اپنی اس تاریخ پر آگیا تھا جو قدرتی (قمری) حساب سے اس کی اصل تاریخ تھی۔ حضور اکرمؐ نے اس بے قاعدگی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر کے خدائی تقویم کے تحت اس آفاقی نظام کو نافذ کر دیا۔

قرآن کے ارشاد کے مطابق ابتدائے آفرینش کے وقت ہی مہینوں اور وقتوں کی تقسیم

سورج کے بجائے چاند کے حساب پر رکھ دی گئی اور کتاب اللہ یعنی لوح محفوظ میں یہی فیصلہ مقدر تھا۔ اس میں مذکورہ تمام حکمتوں میں سب سے بڑی بنیادی حکمت یہی تھی کہ انسان کی حیوانی زندگی میں کام آنے والی تمام خوردنی اجناس، خشک و تر میوہ جات اور خشکی تری میں دستیاب ہونے والے لحمیات و لبنیات غرض معاشی ضرورتیں پوری کرنے والی تمام اشیاء اور گرمی سردی کے موسمی اثرات کی مضرتوں سے بچنے اور نعمتوں سے مستفید ہونے کی کل معاشری سہولتیں جو ایسی ہی نفسانی محرکات کی لازمی بنیاد بن جاتی ہیں اور انسان کو موسم کا دست نگر، محتاج اور صبح و شام منتظر رہنے کا مکلف بنا دیتی ہیں۔ حتّٰی کہ یہ سفلی جذبات ہی مختلف معاشی اور معاشری رسوم و آداب کی مستقل شکل اختیار کر کے انسان کو احکامِ خداوندی کی تعمیل میں رکاوٹ پیدا کر دیتے ہیں اور وہ بڑی بے تکلفی سے دعوتِ حق کے جواب میں کہہ دیتا ہے: حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا . . .

خدا نے پہلے ہی دن انسان کے لیے جو نظام زندگی تجویز کیا اور ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیائے کرام علیہم السلام کے ذریعہ اسی نظام کی تائید و تجدید کو ضروری قرار دیا، اسے پہلے ہی دن ان محدود اور ہر خطۂ ارضی میں مختلف شکلوں میں نمودار ہونے والے تفریق انگیز موسمی محرکات سے بالاتر رکھ دیا اور ایسا نظام مقرر کر دیا جو ساری دنیا اور تمام روئے زمین پر بسنے والی نوعِ انسانی کے لیے ایک اور صرف ایک ہو۔ ادنیٰ نفسانی جذبات سے پیدا ہونے والی ہر تحریک جس کا نتیجہ حیوانیت ہو، بے اضافہ کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس ہمہ گیر ضابطے کے سامنے بے حقیقت اور پامال ہو۔ [illegible] اور موسم کا شر کسی قوتِ مؤثرہ کی صورت میں سامنے نہ آئے، بلکہ انسانی عمل کے تحت رہے موسم سرد ہو یا گرم، مومن اپنی تقریبیں شرعی ضابطے کے تحت منائے، اس لیے کہ انسان خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے صرف خدا کے ہی احکام کا پابند ہے اور دین و دنیا میں خدا کا تشریعی قانون ہی اس کا ضابطۂ حیات ہے۔ یہ جمادات نباتات کی طرح بے شعور نہیں صاحبِ شعور اور خلیفۃ اللہ ہے۔

سنِ ہجری کا سالِ نو

محرّکاتِ عمل

ہر کام کے لیے ضروری ہے کہ کام سے پہلے کام کرنے والے کے دل میں کوئی ایسا جذبہ پیدا ہو جو اس کام کا محرک بن سکے۔ اس تحریک کے بغیر کسی عمل کا سرزد ہونا ناممکن ہے عمل خواہ اچھا ہو یا برا۔ اس محرک جذبے کی بنیاد ارد گرد کے مناظر، حالات اور واقعات ہوتے ہیں جنہیں آنکھیں دیکھتی ہیں، کان سنتے ہیں، دل ان سے متاثر ہوتا ہے اور دماغ اس پر غور کرتا ہے۔ پھر دل اور دماغ کے فیصلہ کے بعد ہاتھ، پاؤں اور دوسرے تمام اعضاء و جوارح حرکتِ عمل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ہر عمل کے وقوع پذیر ہونے کے لیے ان کوائف کا وجود ناگزیر ہے اور پھر یہ بھی ناگزیر ہے کہ جس قسم کے محرکات وجود میں آئیں گے ان محرکات سے پیدا ہونے والے جذبات اور ان جذبات کے نتیجہ میں سرزد ہونے والے اعمال انہی محرکات کے مطابق ہوں گے۔ اگر محرکات کسی عقلی اور نظری بنیادوں پہ پاکیزہ، اعلیٰ اور صاف ستھرے ہیں تو حرکات و اعمال میں بھی پاکیزگی اور بلندی شامل ہو گی اور اگر محرکات کا مایۂ خمیر ہی عقل و نظر کے بجائے محض نفسانیت کی گندگی اور تسفل ہو گا تو لازماً ان محرکات سے سنجیدہ افعال اور پاکیزہ و اعلیٰ اور صاف ستھرے اعمال کی صورت میں نتیجہ برآمد نہیں ہو سکے گا۔

متمدن دنیا کے ہر حصہ میں جہاں بھی کوئی قوم آباد ہے اپنی اپنی قومی اور ملکی روایات کے مطابق سال میں کئی دن تقریبات کی صورت میں ضرور مناتی ہے۔ ان تقریبات کے رسوم

و آداب اور ان دنوں کو منانے کے متعلقہ عوامل اکثر و بیشتر انہی مناظر و کوائف اور احوال و ظروف کے تحت وقوع پذیر ہوتے ہیں اور عمل میں آتے ہیں جو اس ملک اور قوم اور وہاں کی بُود و ماند میں بالعموم معمول بہا اور رائج ہوتے ہیں۔

ان محرکات میں موسم اور آب و ہوا کا اثر

ان عوامل اور موثرات میں سب سے زیادہ اثر انگیز کسی ملک کی آب و ہوا، موسم اور موسمی تغیرات، خورد و نوش کے اسباب و وسائل اور گرمی و سردی سے پیدا ہونے والے محسوسات، تقاضے اور ہیجانات ہیں جن کے تحت کسی ملک کے باشندوں کی معاشری زندگی مرتب ہوتی ہے۔

مثلاً ہمارے ملک میں جو بڑی حد تک زرعی ملک ہے۔ ہندو قوم جتنے تہوار مناتی رہی ہے فصل اور موسم ہی کی تحریک پر تھے۔ فصل ربیع (گندم) کی کاشت سے پوری فراغت اور اس کی ابتدائی منزل نکل جانے پر پہلا تہوار بسنت فروری کے شروع اور ماگھ کے اخیر میں منایا جایا جاتا ہے۔ پھر ذرا آگے چل کر ہولی کے جشن شروع ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ فصل کے تیار ہو جانے پر بیساکھی کا جشن نوروز انتہائی شان و شوکت سے منایا جاتا ہے۔ پھر گرمی کا قریبا سارا موسم اسی ہماہمی میں گزرتا ہے بلکہ ان کے دیکھا دیکھی یہاں اسی فصلی سن و سال کے مطابق ہندوؤں ہی کی رسوم و عادات سے متاثر ہو کر جس طرح وہ اپنے مہنتوں، پروہتوں اور سنتوں وغیرہ کی سمادھوں پر میلے لگاتے تھے مسلمانوں نے بھی اپنے بزرگوں کی قبروں پر عرسوں کا نام دے کر اسی قسم کے میلے لگانے شروع کر دیے۔ جن کی تاریخیں بھی فصلی مہینوں ہی کے مطابق مقرر ہیں اور یہ اکثر میلے ماہ رمضان جیسے مقدس اسلامی شعائر کی حرمت کو پامال کرتے چلے جاتے ہیں اور مسلمان ٹس سے مس نہیں ہوتے۔

بہرحال ان تقریبات اور تہواروں کے محرکات میں خورد و نوش کے مادی اسباب اور نفسانی جذبات کی تحریک کے بغیر کوئی دوسری چیز نظر نہیں آتی یہی وجہ ہے کہ ان موقعوں پر سوائے بیہودہ حرکات، بے قید مظاہروں اور سفلی جذبات کے اظہار و نمائش کے اور کوئی

عمل و کردار سامنے نہیں آتا۔

اسلام نے انسان کے لیے جو نظامِ زندگی ترتیب دیا ہے وہ ان مادی محرکات اور ادنیٰ درجہ کے سفلی جذبات سے یکسر پاک ہے۔ یہ مادی محرکات کے روحانی محرکات کی تربیت کرنا، انہیں ترقی دینا اور انہیں ہر انسانی عمل میں شامل کرنا ضروری سمجھتا ہے اس نے اپنی آفاقی حیثیت کو قائم کرنے اور برقرار رکھنے کے لیے سرے سے فصلی سن و سال ہی کو نظر انداز کر دیا ہے تاکہ محرکات کی مادی بنیادیں ہی ختم ہو جائیں اور انسانی زندگی میں صرف عمل کی فرماں روائی قائم رہے۔ اس نے معاشرتی نظام میں فصلی سن کے بجائے قمری سن کو رواج دیا ہے اس لیے کہ اسلام کے عقلی نظام میں وزن اور اعتبار صرف عمل کو حاصل رہے اور بس سن و سال اور کسی وقت اور تاریخ کو اس ہمہ گیر اور آفاقی نظام میں کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ مسلمان کے نزدیک اگر کوئی دن یاد رکھنے کے قابل ہے بھی تو وہی دن ہے جس میں کوئی قابلِ ذکر عمل سامنے آیا ہو، کیونکہ وزن صرف عمل کو حاصل ہے نہ دن کو۔ کوئی دن، دن ہونے کی حیثیت سے نہ متبرک ہے نہ منحوس۔

سال و ماہ اور روز و شب کا سلسلہ ہمیشہ سے ایک جیسا چل رہا اور نہ جانے کب تک چلتا رہے گا۔ ایک ہی چاند اور ایک ہی سورج کے نئے نئے نام رکھ کر نئے نئے روز و شب تبدیل کر لیے جاتے ہیں اور انسان اپنے حالات کے مطابق نئے ناموں کی تعیین کر کے اپنی غیر یقینی زندگی میں یقین پیدا کرنے اور اسے بزعمِ خود آگے بڑھانے کی ناکام کوشش اور اس حیاتِ مستعار پر استقلال کا رنگ چڑھانے کے فریب میں مسلسل مبتلا چلا جا رہا ہے۔

وقت کی حقیقت

وقت ایک ایسی غیر متناہی مدت کا نام ہے جس کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ پر ترجیح دینے یعنی ایک کو دوسرے حصہ سے بہتر قرار دینے کے لیئے کوئی عقلی دلیل اور

وجۂ جواز موجود نہیں۔ البتہ انسان اپنے اس عمل کی خوبی و ناخوبی اور عمل ہی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی مسرت اور تلخ کامی کی بنا پر جو کسی وقت میں رونما ہوئی اور پیش آئی ہو، وقت کے کسی ایک حصہ کو یاد رکھ لیتا ہے اور وقت کا یہ حصہ جو اس عمل پر صرف ہوا، بعد میں آنے والے کچھ ہم قوم، ہم ملک اور ہم خیال لوگوں میں یادگار بن جاتا ہے ۔۔۔ حالانکہ خصوصیت وقت، دن اور ماہ و سال میں نہیں جنھیں یادگار بنا لیا گیا ہے؛ بلکہ خصوصیت اس عمل میں ہے جس عمل نے وقت کے کسی ایک حصہ کو خوبی و ناخوبی کی نسبت یا مسرت و تلخ کامی کے لیے مخصوص کیا ہے۔

اس لیے یاد رکھنے کے قابل فی الحقیقت انسان کا عمل اور صرف عمل ہے جو کسی وقت و دن اور ماہ و سال کو یادگار بننے کی عزت اور خصوصیت بخشتا ہے نہ کہ فی ذاتہ سن و سال اور روز و شب جو ایک ہی صورت میں مسلسل آ رہے ہیں اور جا رہے ہیں! ان سے کوئی بلند ہمت چاہے تو نفع بھی حاصل کر سکتا ہے اور کوئی پست خیال نقصان بھی اٹھا سکتا ہے لیکن بالعموم کوتاہ نظر اور پست ہمت انسان عمل کو یاد رکھ کر اور محض اس کی یاد کو تازہ کر کے عمل کی محنت و مشقت بلکہ مشقت کے تصور تک کی ذہنی تکلیف سے بھی بچنا چاہتا ہے اور اس کے مقابلے میں محض دوسروں کی محنت سے فائدہ اٹھانے کو غنیمت سمجھ لیتا ہے جس کی محنت اور قربانیوں نے کسی دن اور تاریخ کو یادگار بننے کی خصوصیت بخشی ہے۔ اسی ذہن کے تحت یادگاروں کے سلسلہ میں بھی بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کی عملی مشقت اور ریاضت سے تو بچتا ہے اور ان کے کارناموں اور قربانیوں کی یاد میں محض کسی دن، کسی تاریخ اور کسی وقت کو تبرکاً لطور یادگار منا لینا ہی کافی خیال کر لیتا ہے اور اس طرح لہو لگا کے شہیدوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ شہید کربلا سید الشہداء حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی یاد میں کسی غلط حکومت کو بدلنے کے لیے جانبازی اور سرفروشی کے مقابلے میں آہ و بکا اور سینہ کوبی بہرحال آسان ہی قرار دی جائے گی۔

اسلام کی فطری تعلیم اپنے ہر حکم میں ایک ٹھوس حکمت مضمر رکھتی ہے اور قرونِ اولیٰ کے مخلص اور عمل کے شیدائی مسلمانوں کی حقیقت بین جماعتِ صحابہ رضؓ کے ہر عمل میں اس حکمت کی عملی روح موجود ہے۔ اس مقدس جماعت نے آج کے مسلمانوں کی طرح تن بہ تقدیر سپرد کر کے ہر حرکت سوچ کی پوجا نہیں کی بلکہ خالقِ کائنات کے احکام پر عمل کر کے ہمیشہ حقیقت پر نگاہ رکھی اور اہلِ بصیرت کے لیے وہ اسوہ یادگار چھوڑا جو ماہ و سال کا محتاج اور پابند نہیں بلکہ گردشِ لیل و نہار اور ماہ و سال کے انقلابات ان کے اشارۂ ابرو کے منتظر رہے ہیں ؎

تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز

تھی نہاں جن کے اشاروں میں خدا کی تقدیر

صحابہ رضؓ کی مقدس جماعت نے سنؔ کے سلسلہ میں بھی فصلی اور موسمی اثرات اور اتفاقی حالات کے بجائے اپنے قومی سنؔ کی بنیاد چاند کی تاریخوں کے تحت ہجرت نبوی علیہ افضل الصلوات والتسلیمات کی زندگی کے اس انقلابی واقعۂ ہجرت کو بنیاد بنایا جو خدا کی راہ میں انسانی عمل کا اہم واقعہ اور تعمیرِ انسانیت کی راہ میں ایک خاص موڑ ہے تاکہ قوم کے سارے معاشری نظام پر ماہ و سال، فصل و موسم اور بہار و خزاں کے مادی تصورات اثر انداز نہ ہوں، بلکہ قوم کے نظامِ زندگی پر اللہ کے حکم کے مطابق سر تا سر عمل اور محض عمل ہی کی فرمانروائی قائم ہو اور قائم رہے۔ قوم کا فکر ذہن اور کردار و عمل وقت اور ماحول کے تاثر سے پیدا ہونے والے رسوم و عادات سے متاثر نہ ہو، بلکہ پوری آزادی اور خودداری سے دین کے زیرِ ہدایت اپنے مخصوص طرزِ حیات کو محفوظ رکھ سکے۔ اس کا فکر اپنا فکر ہو اور اس کا عمل اپنا عمل۔ کلمۂ حق کے شجرۂ طیبہ کی طرح اسلام کو ماننے والی قوم بھی بہار و خزاں سے بے نیاز بمصداق تُؤْتِيْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا (اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت اپنے پھل لاتا رہتا ہے) اپنے خاص فکری و نظری نظام کے تحت سدا بہار زندگی بسر کرتا رہے۔

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند

بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

اُمت مسلمہ کے مؤسس اعظم حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آج سے چار ہزار سال پہلے حج کے بین الاقوامی اجتماع کی تاریخ کو موسم میں مقید کرنے کے بجائے چاند کے حساب کے مطابق مقرر کیا اور اس مہینہ کا نام ہی ذی الحج قرار پایا۔

آج ہمارے معاشرے میں ہجری سن و سال کو رواج حاصل نہیں۔ ملک کی آزادی کے پینتیس سال گزر جانے پر بھی کئی دوسری یادگاروں کی طرح اب تک انگریزی دورِ حکومت کی یادگار سن عیسوی بھی ہماری زندگی کے ماہ و سال، روز و شب بلکہ ایک ایک لمحہ پر مسلط ہے۔ ہماری زندگی میں طلوع ہونے والا ہر سورج اسی روشنی میں طلوع ہوتا ہے اور اسی یاد کی امانت دے کر غروب ہو جاتا ہے۔ لین دین کے تمام معاملات، سفر و حضر کا ہر حرکت و سکون، غم و شادی کی کل تقریبات، موت و پیدائش کے سارے واقعات کی یادیں، دفتروں کی حاضریاں، کاروبار کی مصروفیتیں، تفریحات کی فراغتیں۔ غرض معاشری زندگی کا ایک ایک لمحہ اسی عیسوی میلادی سن کی یاد کو ہماری نگاہوں کے سامنے تازہ رکھتا ہے جو فرنگی آقاؤں نے ہمیں اپنی غلامی کا جُوا پہناتے وقت شاہی جھنڈے اور دوسرے حاکمانہ نشانات کے ساتھ اس سب سے اونچے روشن اور ہر جگہ سے دکھائی دینے والے ہمہ گیر نشان کو بھی ہمارے معاشرے کی فصیل پر نصب کیا تھا اور اب تک اسی طرح نصب ہے۔

سن و تاریخ کے اس معمول میں جو ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں چل رہا ہے گو بظاہر کوئی خرابی محسوس نہیں کی جاتی۔ لیکن کیا یہ خرابی کم ہے کہ ہم اس پر حکمت مصلحت بلکہ ہزار مصلحتوں سے محروم ہیں جن کے پیشِ نظر اکابر صحابہ کی مقدس جماعت نے بالاتفاق تمام ملکوں کے رواجات کو نظر انداز کر کے ہمارے لیے قمری سن و سال کو معمول بہا قرار دیا۔ ہجرت کے واقعہ کو بنیاد بنایا اور اسلامی نظامِ حکومت میں اس کو بنیادی حیثیت دی تاکہ مختلف ممالک کے مختلف موسموں اور فصلوں میں اس عالمگیر نظام کے شرعی احکام کی بجاآوری یکساں جاری رہ سکے۔

دین و دنیا کی علیحدگی کا غلط تصوّر

اعتقادی سرمایہ کے اس عظیم نقصان کے علاوہ جس نقصان سے بچنے کے لیے

اکابر صحابہ رضؓ نے کسی ملک کی فتح و تسخیر کے بجائے حق کی حفاظت میں خود اپنے ملک کو چھوڑ جانے کی یاد کو مقدم سمجھا۔ ہمارے معاشرے کو جو ادنیٰ سے ادنیٰ ہجری سن کا رواج چھوٹ جانے سے پہنچا ہے اور پہنچ رہا ہے وہ یہ ہے کہ ہماری زندگی کے معاشی اور معاشرتی تمام معمولات اور معاملات تو سن عیسوی کے تحت چل رہے ہیں، لیکن روزہ، حج، عیدین کے اجتماعات، زکوٰۃ کی ادائیگی کے اوقات اور دیگر اسلامی تقریبات چونکہ سن ہجری کی تاریخوں کے تحت آتی ہے اس لیے یہ غلط اور گمراہ کن تصور ہمارے معاشرے میں الٹا پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا جا رہا ہے کہ دین کو دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں تک کہ دین، دین کے فرائض و احکام اور ان فرائض و احکام کی پاس داری صرف ایک مقدس امانت بن کر رہ گئی ہے جسے ہماری روزمرہ کی زندگی اور معاشری معاملات سے کوئی تعلق نہیں رہ گیا۔

اسلامی تقریبات کا تعارف ہمارے کیلنڈروں اور ڈائریوں میں محض اضافی نشانات سے کرایا جاتا ہے، معمول کی حیثیت سے نہیں ہوتا جس طرح باقی معاملات کا ہوتا ہے اسلامی تقریبات رعائتی رخصتیں کے تحت منائی جاتی ہیں۔

اس غلط معمول اور غیر دینی طرزِ زندگی نے دینِ اسلام کو جو زندگی کا مکمل ضابطہ حیات پیش کرتا ہے انسانی زندگی کا پرائیویٹ معاملہ بنانے اور باور کرانے میں وہ نمایاں خدمت انجام دی ہے اور دے رہا ہے جو کسی صاحبِ بصیرت کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں۔

ہوئی دین و دنیا میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری

ہر وہ چیز جو کسی عقیدے، مسلک یا طرزِ فکر و عمل کی نمائندگی کرتی ہو یا علامت اور نشان کا کام دیتی ہو، وہ اس کا شعار کہلاتی ہے۔ جس طرح سرکاری جھنڈے، فوج اور پولیس کی خاص وردیاں، نوٹوں، اسٹامپ اور ٹکٹ وغیرہ کے چھاپے، سکّوں کے نقوش وغیرہ حکومتوں کے شعائر ہیں۔ گرجا، صلیب وغیرہ مسیحیت کے، زُنّار، مندر، چوٹی ہندوؤں کے،

کیس، کڑا، کرپان وغیرہ سکھوں کے اور ہتھوڑا، درانتی اشتراکیت کے شعائر ہیں اور یہ سب مسلک اپنے ماننے والوں سے ان شعائر کے احترام کا مطالبہ ہی نہیں کرتے بلکہ ان کی توہین اور انکار کو بغاوت قرار دیا جاتا ہے ـــ بالکل اسی طرح مسلمان ہوتے ہوئے ہجری سن کو ترک کرنا بھی یقیناً اسلام کے ایک شعار کو ترک کرنے اور اس کی توہین کے ہم معنی ہے۔

اس سلسلہ میں قرآن حکیم کا واضح حکم

(خلافت کبریٰ تفسیر خواجہ عبدالحی فاروقی)

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

(البقرہ: ۲۴)

"تم سے چاند کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہہ دو کہ لوگوں کے معاملات اور حج کے اوقات اس سے معلوم ہوتے ہیں اور گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آنا نیکی نہیں، بلکہ نیکی یہ ہے کہ ایک شخص تقویٰ اختیار کرے اور دروازوں میں سے ہو کر گھروں میں آئیے اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔"

سوال یہ ہے کہ تبادلہ اشیاء اور لین دین کے جس قدر معاملات ہوں گے ان کا حساب کتاب کن مہینوں کے مطابق ہوا کرے گا شمسی یا قمری؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شمسی حساب میں بڑی دقتوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ ایک ہی حالت میں رہتا ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اگر طلوع و غروب کے لحاظ سے اس میں معمولی سا تغیر ہوتا ہے تو عام نظریں اس کو محسوس نہیں کر سکتیں اس کے لیے اعلیٰ ترین مجالس رصد کی ضرورت ہے۔ جنتریوں کے بغیر کام نہ چل سکے گا اور ایسے دیہات و قصبات بکثرت ملیں گے۔ جہاں کے لوگ تہذیب، و تمدن کے نام سے ناآشنائے محض ہوں گے

وہاں عمدہ ترین حساب دانوں کا ملنا تکلف سے خالی نہ ہوگا۔ اس لیے مسلمانوں کے واسطے قمری حساب مناسب رہے گا، ان کا مذہب عالمگیر ہے اور تمام اقوام عالم کی طرف اس کا روئے سخن ہے۔ چاند کی شکلوں میں اس کا جلد جلد تغیر ہوتا رہتا ہے ہر تعلیم یافتہ اور جاہل اس فرق کو دیکھ کر اوقات معین کر سکے گا۔ وہی تغیرات ضبطِ اوقات کا کام دیں گے۔ چنانچہ امتِ مسلمہ کے موسس اوّل ابراہیم علیہ السلام نے قمری حساب کے مطابق حج اور قربانی کے ایام مقرر کیے ہیں۔

اگر حساب شمسی ہوتا تو اس میں یہ بھی ایک تکلیف رہتی کہ رمضان و حج کے جو اوقات مقرر ہو جاتے وہی رہتے۔ ان میں تغیر و تبدّل نہ ہو سکتا، اگر ایک قوم اس دوام کی وجہ سے آرام میں ہوتی، تو دوسری کو مصیبت برداشت کرنی پڑتی۔ اب قمری حساب کے بموجب سال بھر کے مختلف موسموں میں ان فرائض کو ادا کرنے کا موقع ملے گا اور ہر قوم ان سے بہرہ اندوزِ سعادت ہو سکے گی۔

زمانۂ جاہلیت میں دستور تھا۔ کہ احرام حج باندھنے کے بعد گھر میں جانا ممنوع خیال کیا جاتا تھا، اس لیے پشت کی جانب سے نقب لگا کر اندر آجاتے اور اس کو باعثِ ثواب خیال کرتے، خدا نے کہا یہ لغو اور مہمل حرکت ہے، بہتر یہ ہے کہ محرماتِ الٰہیہ سے پرہیز کرو، خدا کا خوف دل میں رکھو، اور پھر اگر تم دروازے میں سے گھر کے اندر آ گئے تو گناہ کی بات نہیں۔

قرآن حکیم کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ ایک مثال بیان کر کے اس سے مختلف قسم کے قوانین وضوابط کا استنباط کرتا ہے۔ سورۂ آل عمران میں غزوۂ اُحد کا تذکرہ کر کے صدہا مسائل کا استخراج کیا، سورۂ انفال میں صرف غزوۂ بدر کو پیش نظر رکھ کر پورا قانون جنگ مرتب کر دیا۔ اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ان قاعدوں کو اچھی طرح ضبط نہ کر سکیں وہ اس مثال کو خوب ذہن نشین کر لیں۔ یہ قوانین خود بخود سمجھ میں آ جائیں گے

شریعت نے جو قانون بنایا ہے اسے گھر تصور کیجئے۔ اب دستور یہی ہے کہ اس میں داخل ہونے کے لیے جو دروازہ بنایا گیا ہے اسی میں ہو کر اندر جانا چاہیے اگر ایک شخص اس کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے اور دیوار پھاند کر اندر داخل ہونا چاہتا ہے تو گویا وہ مقصدِ اصلی کو فوت کر رہا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے حج کے لیے جو ایام مقرر کیے وہ قمری مہینوں میں ہی آتے ہیں اور ان کا منشا یہی ہے کہ مسلمان اپنا تمام حساب کتاب چاند پر رکھیں، اب جو لوگ اس میں ردّ و بدل کی کوشش کرتے ہیں وہ دراصل قوم کے نظامِ صالح کو برباد کرنا اور شریعت کی بلند عمارت کو گرانا چاہتے ہیں۔ کوئی عقلمند اسے نیکی کے نام سے تعبیر نہیں کر سکتا کہ قانون کے اصول اساسی فنا ہوں۔ اس کی اصلی شکل و صورت میں تغیر آجائے، بلکہ برّ و احسان اور تقویٰ و طہارت یہی ہے کہ اپنے تعلقاتِ الٰہیہ کو درست کر لو، امامِ ملّت نے جو قانون بنا دیا ہے، اس کو مضبوطی سے پکڑ لو، اگر تم نے اللہ کے قانون کی پابندی کی اور مذہب تمہاری زندگی کی ہر شاخ میں کارفرما رہا تو یقیناً علوّ و رفعت اور برتری تمہارے ہی لیے ہے، کیونکہ اوائل عمر ہی سے گھروں میں ایسی تعلیم دی جاتی گی جس سے ایک طرف تو مذہبی جذبات و عواطف اسلام میں راسخ ہوتے جائیں گے اور اس کے ساتھ تدبیر منزل کے قانون پر عمل کر کے ملکوں اور قوموں کی باگ اپنے ہاتھ میں لے سکیں گے لیکن یہ نتائج و ثمرات صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں۔ جب کہ قانونِ الٰہی میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے اور ادخلوا فی السلم کافۃ پر پورا پورا عمل ہو۔

خدائی تقویم

مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر تدبر قرآن کی تیسری جلد میں سورہ توبہ کی تفسیر لکھتے ہوئے شمسی نظام کے مقابلے میں قمری سنہ کے نظام کو خدائی تقویم کا نام دیا ہے جو فی الواقعہ ایک ابدی حقیقت کا اظہار ہے اس لیے کہ یہی وہ نظام ہے جس کے

تحت ایک عالمگیر فطری دین کے ماننے والوں کو اپنا نظام زندگی چلانا زیبا ہو سکتا ہے۔
یہی وہ نظام ہے جو کسی حق پرست جماعت یا قوم کو ملکی آب وہوا کے موسمی اور مادی محرکات سے پیدا ہونے والے رسم ورواج اور گم کردہ راہ آباؤ اجداد کی کورانہ تقلید کی غیر عقلی پابندیوں سے محفوظ رکھ کر صرف احکام خداوندی کا پیرو بنا سکتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے۔ جہاں اشرف مخلوقات انسان نباتات وجمادات سے ارفع واعلیٰ مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے۔ اور خلافتِ الٰہیہ کا مستحق قرار پاتا ہے۔

تقدیر کے پابند نباتات وجمادات
مومن فقط احکام الٰہی کا پابند!

اقتباس تفسیر

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ مِنْهَاۤ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ۬ۙ فَلَا تَظْلِمُوْا فِیْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِیْنَ كَآفَّةً كَمَا یُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةًؕ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ۝ اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْكُفْرِ یُضَلُّ بِهِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّ یُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّیُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَیُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُؕ زُیِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ۠

"بے شک مہینوں کی تعداد، اللہ کے ہاں، نوشتۂ الٰہی میں، جس دن سے اُس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا، بارہ مہینے ہیں جن میں چار حرمت والے ہیں یہی دین قیم ہے . . . . یہ نسیئ کفر میں ایک اضافہ ہے جو کافروں کی ایک گمراہی کا ذریعہ بتائی گئی۔ کسی سال اس کو حلال ٹھہرا دیتے ہیں کسی سال حرام کر خدا کے حرام کیے ہوئے کی گنتی پوری کر کے اس کے حرام کیے ہوئے کو جائز بنالیں۔ ان کی نگاہوں میں ان کے برُے اعمال کھبا دیے گئے ہیں اور اللہ کافروں کو راہ یاب نہیں کریگا۔"

ان عدة الشهور عند الله . . . . . الخ

یہ بطور تمہید قمری مہینوں کی عظمت و اہمیت واضح کی گئی ہے کہ یہی مہینے

کائناتی، آفاقی اور خدائی مہینے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے تعین کے لیے قدرت نے خود کائنات کے نظام میں ایک نہایت محکم انتظام کرایا ہے جو پوری باقاعدگی سے سال اور مہینوں کا حساب ایک عامی سے عامی آدمی کے لیے واضح کرتا رہتا ہے۔ والقمر نورا وقدرہ منازل لتعلموا عدد السنین والحساب (یونس، ۵) (اور چاند کو روشنی بنایا اور اس کے لیے منزلیں ٹھہرائیں تاکہ تم سالوں کی تعداد اور حساب کا تعین کر سکو۔)

یہی خدائی تقویم ہے جو نوشتۂ الٰہی میں موجود اور اس دن سے جاری و نافذ ہے جس دن خالق کائنات نے اس آسمان اور زمین کو پیدا کیا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس طرح کی کوئی کائناتی شہادت ان تقویموں میں سے کسی بھی تقویم کے حق میں موجود نہیں ہے جو انسانوں نے بنائی ہیں۔ یہ خدائی کیلنڈر ہر مہینے میں افق پر نمایاں ہو کر اپنے ہر روز بدلتے والے نمایاں اور چمکدار نشانوں کے ذریعہ سے دنوں، مہینوں اور سالوں کے حساب بتاتا رہتا ہے اور کبھی اس میں کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ فی کتاب اللہ یعنی اُس خدائی کتاب میں جس میں اس کائنات سے متعلق تمام احکام و قوانین مندرج ہوئے ہیں، یہ حکم بھی مندرج ہوا کہ اس قمری مہینوں کے حساب سے بارہ مہینوں کا سال ہوگا جن میں سے چار مہینے حرمت والے قرار پائیں گے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان بارہ مہینوں میں کوئی کمی یا بیشی کرنا یا ان کو آگے پیچھے ہٹانا اس خدائی کیلنڈر میں خلل پیدا کرنا ہے جو کائنات کے خالق کے منشا کے بالکل خلاف ہے۔

ذلک الدین القیّم یعنی یہی صحیح، فطری اور کائناتی دینی تقویم ہے جس طرح اسلام دین قیم ہے اس لیے کہ اس کی شہادت آفاق و انفس میں موجود ہے اسی طرح یہ قمری جنتری اصل دینی جنتری ہے اس لیے کہ اس کی شہادت آفاق میں موجود ہے۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ جس طرح ہماری کھیتی باڑی میں فصلوں اور موسموں کا اعتبار ہے اسی طرح دینی امور میں بھی اوقات، ایام اور سالوں کا اعتبار ہے جس طرح بے وقت اور بے موسم کی زراعت لاحاصل اور بے برکت ہو کے رہ جاتی ہے۔ اسی طرح بے وقت

کی نماز، بے وقت کا روزہ اور بے وقت کا حج بھی لاحاصل ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہوا کہ اس جنتری کو بھی شرعی اور دینی حیثیت حاصل ہو جس کے تحت دین کی عبادات اور اس کے احکام و مناسک منضبط ہوتے ہیں۔ اسی پہلو سے اس تقویم کو دین قیم" کہا ہے۔ اس لیے کہ یہ دین ہی کا ایک حصہ ہے۔ اس میں کوئی تغیر و تبدل کرنا دین میں تحریف کے ہم معنی ہے۔ . . . .

انما النسی زیادۃ فی الکفر یضل به الذین کفروا۔۔۔ نسأ کے معنی مؤخر کرنے اور پیچھے ہٹانے کے ہیں۔ اسی سے نسأ البعیر دفعه عن الحوض ہے جس کے معنی ہیں" اونٹ پانی کے گھاٹ پر پہنچنے سے روک دیا۔ نسأ الراعی فی ظمئ الابل "چرواہے نے اونٹوں کے پانی پلانے کو چند دن پیچھے ہٹا دیا" اسی سے "نسی" کا اسم بنا لیا گیا ہے۔ جس سے عرب جاہلیت کی اصطلاح میں وہ مہینہ مراد ہے جس کو چند دن پیچھے ہٹا کر اس کے دنوں میں اضافہ کر دیتے تھے۔ شمسی سال قمری سال سے تقریباً گیارہ دن زیادہ ہوتا ہے۔ قمری سال کی اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اہلِ عرب یہ کرتے تھے کہ اس میں کمی کے بقدر اضافہ کر دیتے۔ جس کی عملی شکل یہ تھی کہ ہر آٹھ سالوں میں تین ماہ بڑھاتے جاتے۔ گویا ہر دوسرے یا تیسرے سال کے خاتمہ پر ایک ماہ "کبیسہ" کا ہوتا اس طرح اپنے زعم کے مطابق انہوں نے قمری مہینوں بالخصوص "اَشْہُرِ حُرُم" کا احترام بھی قائم رکھا تھا اور اپنے تجارتی فوائد و مصالح کے نقطۂ نظر سے اس کو شمسی بھی بنا لیا تھا۔ اہلِ عرب نے تو یہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اس تخیل کے تحت کیا کہ اس طرح اَشْہُرِ حُرُم کی تعداد بھی پوری ہو جاتی ہے جو دینداری کا مقتضی ہے اور ان کا کاروباری مفاد بھی محفوظ ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآن نے ان کی اس دینداری کو تسلیم نہیں کیا بلکہ ان کو ان کے کفر میں ایک مزید اضافہ قرار دیا جو راہِ راست اور دین قیم، ملتِ ابراہیمؑ سے ان کے مزید انحراف کا موجب ہوا۔

یحلونه عاما ویحرمونه عاما لیواطئوا عدة ما حرم اللہ فیحلوا

ما حرم اللہ ط یہ دلیل ارشاد ہوئی کہ کیوں یہ چیز کفر میں اضافہ ہے۔ فرمایا کہ اس وجہ سے کہ اس طرح خدا کے محترم کیے ہوئے مہینوں کی گنتی تو ضرور پوری ہو جاتی ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ اللہ کے مُحترم کیے ہوئے شمسی سال کے اس چکّر میں آ کر کبھی محترم بن جاتے ہیں، کبھی غیر محترم۔ دراں حالیکہ اللہ نے جن مہینوں کو محترم قرار دیا محترم وہی ہیں۔ نہ یہ کسی دوسرے مہینے سے تبدیل ہو سکتے کہ ان کا احترام کسی دوسرے مہینے کی طرف منتقل ہو سکتا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس طرح قمری سال کو شمسی سال میں تبدیل کرنے کی جو کارروائی عمل میں آئی اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ موسم حج اور اشہر حُرم سب ۳۳ سال کے لیے اپنی جگہ سے ہٹ جاتے۔ ۳۳ سال کی گردش کے بعد پھر یہ اپنی جگہ پر ایک مرتبہ کے لیے واپس آتے تقدیر الٰہی نے یہ کام کیا کہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر، جب سرورِ عالم ؐ نے حج فرمایا، اپنی گردش پوری کر کے حج ٹھیک اس تاریخ کو پڑا جو اس کی اصل خدائی اور ابراہیمی تاریخ تھی۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان فرمایا کہ ان الزمان استدار کھیئة یوم خلق السموات والارض (زمانہ گردش کر کے اپنی اصلی ہیئت پر آ گیا ہے، جو ہیئت اس کی اس دن قرار پائی تھی جس دن اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا) اُسی دن سے آپ نے اس خدائی تقویم کے نفاذ کا اعلان فرما دیا اور "نسیء" کی تقویم ختم کر دی حضور ؐ کے الفاظ میں صاف اس آیت کی جھلک ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔ ان عدة الشھور عند اللہ ۔۔۔۔۔، الخ

زین لھم سوء اعمالھم واللہ لا یھدی القوم الکفرین یعنی یہ کفر اور اسلام دونوں کا جوڑ ملا کر اشہر حُرم کی گنتی پوری کرنے کی جو نمائش کی گئی یہ دین داری نہیں ان کی بدعملی ہے۔ جو ان کی نگاہوں میں کھبا دی گئی ہے جس کو یہ دین سمجھے بیٹھے ہیں۔ اللہ ایسے کافروں کو بامراد نہیں کرے گا۔ اس طرح کی دین داری قیامت کے دن اکارت ہو

کے رہ جائے گی"۔

تفصیل بالا سے صاف ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا یہ سارا دھندا محض اپنے معاشی معاشری کاروبار چلانے کی غرض سے تھا جس کاروبار کا تعلق نفسانی اور جسمانی تحریکات اور ضروریات سے متعلق تھا۔ اسلامی تحریک کا نصب العین ان سفلی محرکات سے بالاتر ہے اس کے سامنے بلند تر انسانی اخلاق کی تہذیب و تربیت ہے۔ جس کے تحت انسان کی مادی ضروریات حیوانی نہیں انسانی سطح پر خود بخود پوری ہو جاتی ہیں اور معاشری نظم و نسق آفاقی اور عالمی حیثیت سے مربوط ہو جاتا ہے۔ جس میں روئے زمین کا ہر ملک خواہ اس کا موسم کچھ ہو، آب و ہوا کچھ ہو اور اس کے رسم و رواج کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ قمری نظام کی یکسانی اسے اپنی آغوشِ شفقت میں لے لیتی ہے۔

رفعِ اشتباہ

یہاں ایک شبہے کا رفع کر دینا بھی ضروری نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ بارہ مہینوں میں سے چار مہینوں کو اہلِ عرب نے سفرِ "حج" یعنی ان بتوں کی پرستش کے لیے جو بیت اللہ شریف میں ہر قبیلہ نے اپنا اپنا نصب کر رکھا تھا سفر میں سہولت کی غرض سے متفقہ طور پر حرام تسلیم کر رکھا تھا اس سے یہ مغالطہ نہیں پیدا ہونا چاہیئے کہ ان مہینوں کو کوئی خاص مہینہ ہونے کی حیثیت سے حرمت حاصل ہے۔ یہ بھی دوسرے مہینوں کی ہی جیسے مہینے ہیں مسلمانوں کو صاف حکم ہے کہ اگر یہ لوگ تم سے ان مہینوں میں جنگ کریں تو تم بھی جنگ کرو خواہ حرمِ کعبہ ہی میں کرنی پڑے۔ اکثر لوگوں نے فِیْهِنَّ کی ضمیر کا مرجع اثنا عشر کو قرار دیا ہے[1] رلجة کو نہیں۔

۲ — پہلے لکھا جا چکا ہے کہ دراصل وقت اس مدت کا نام ہے جو کسی کام کے کرنے پر صرف ہوتی ہے، اس لیے عمل کے مقابلے میں اس کی حیثیت بہر حال دوسرے درجہ

پر ہے۔ اس کی یاد عمل ہی کے طفیل سامنے آتی ہے اور جس کسی دن، وقت اور تاریخ کو یاد اور مقدس یاد کا شرف اگر حاصل ہوا ہے تو اس شرف و تقدس کی شان کا مستحق دراصل وہ کارنامہ ہے جو اس وقت میں انجام پایا اس لیے یاد کے قابل اور ستائش و خراج تحسین کی حقدار صرف اور صرف وہی شخصیت ہو گی جس کے ہاتھوں یہ قابلِ ستائش کوئی نیک عمل ظہور میں آیا، بلکہ ذرا اور غور کرو گے تو نگاہیں اس سے آگے جائیں گی۔ یہ شخصیت بھی اسی بنا پر قابلِ احترام سمجھی جائے گی کہ اس سے یہ نیک عمل سرزد ہوا۔ غرض اس سارے سلسلہ میں اصل الاصول نیک عمل ہی نظر آئے گا۔ خود عمل کرنے والے کی ذات بھی پیچھے رہ جائے گی۔

لیکن کسی دن کو دن کی حیثیت سے قابلِ یاد منانے اور کسی دن کی یاد منا کر اسے یاد رکھنے والے لازماً اور یقیناً اصل کو فراموش کر دیتے ہیں بلکہ غیر ارادی طور پر ان کو دن کی یاد اور اس یاد کے اہتمام میں اصل حقیقت قطعاً فراموش ہو جاتی ہے۔ کیونکہ انسانی حواس ایک وقت میں ایک ہی طرف توجہ دے سکتے ہیں۔ وقت اور دن کا احترام کرنے والی توجہات یقیناً عمل سے دوسری جانب ہوں گی اور ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آج کی منائی جانے والی مشہور تقریبات میں تقریبیں منانے والے عقیدت مند جو جو عوامل انجام دیتے ہیں اور جن جن طریقوں سے متعلق شخصیتوں کے سامنے اظہارِ عقیدت کرتے اور خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں وہ سب کچھ ان مقدس ہستیوں کی زندگی کے طرزِ عمل کے بخطِ مستقیم خلاف ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر بالفرض وہ بزرگ خود آ کر دیکھیں تو انہیں اپنی پاک زندگی کی تصویر کا ان عوامل میں کوئی ایک پہلو بھی نظر نہ آئے گا۔ نظامی گنجوی نے بڑی سادگی اور صفائی سے اس حقیقت کو بیان کیا ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عالمِ تصور میں مخاطب ہو کر عرض کرتا ہے:

دین ترا در پے آرائش اند
در پے آرائش و پیرائش اند
بس کہ بر و بستہ شدہ برگ و ساز
گر تو بہ بینی نشناسیش باز

(اے پیغمبرؐ! تیرے عقیدت مند تیرے دین کی آرائش میں مصروف ہیں اور اس کی زیب و زینت کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ چنانچہ اس پر ایسے گوٹے کناریاں لگا دی ہیں کہ حضورؐ! اگر آپ خود بھی آکر دیکھیں تو ہرگز پہچان نہ سکیں کہ یہ وہی دین ہے جو میں نے ان کے سپرد کیا تھا۔)

یہ محض تصورات اور قیاسات یا شاعرانہ تخلیات نہیں۔ قرآن حکیم کے بیان کردہ حقائق اور ایمان سے تعلق رکھنے والے بنیادی عقائد کا بیان ہے۔ قومیں انبیائے کرام کی پیروی چھوڑ کر جب خود پیدا کردہ رسوم و رواجات میں گمراہ ہو جاتی ہیں تو اپنے پیغمبروں اور رہنماؤں کی عقیدت ہی کے جوش میں ایسے ایسے طریقے اور ایسے ایسے عقیدے اختیار کر لیتی ہیں جن کا پیغمبر کی ہدایت اور تعلیم سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ اگر ان مقدس ہستیوں کو اپنی قوم کی اِن حرکات کے دیکھنے یا سننے کا موقع ملے تو واقعی نہ پہچان سکیں۔

قیامت کے دن جب ہر شے سامنے آجائے گی اللہ تعالیٰ تمام انبیاء کو جمع کر کے پوچھے گا:

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۭ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝	اس دن کو یاد رکھو جس دن اللہ سب رسولوں کو جمع کرے گا پھر پوچھے گا کہ تمہیں کیا جواب ملا؟ وہ کہیں گے

ہمیں کچھ علم نہیں۔ غیب کی باتوں کا تو جاننے والا بس تو ہی ہے۔

سورۂ مائدہ کے آخری رکوع میں کس صاف الفاظ میں اس حقیقت کو بیان فرمایا گیا ہے۔ میدانِ محشر میں اللہ تعالیٰ کا سوال اور حضرت عیسےٰؑ کا جواب ملاحظہ ہو:

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۤ بِحَقٍّ ڲ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ۭ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝	اور جب قیامت کے دن اللہ فرمائیگا کہ اے عیسیٰ بن مریم! کیا تُو نے لوگوں سے کہا تھا۔ کہ خدا کے سوا

نجھے اور میری ماں کو بھی خدا بنا لو؟

تو وہ جواب میں عرض کریگا۔ کہ

سبحان اللہ! میرا یہ کام نہ تھا کہ وہ بات کہتا جسے کہنے کا حق مجھے نہ تھا، اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو آپ کو ضرور علم ہوتا۔ آپ جانتے ہیں جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ آپ کے دل میں ہے۔ آپ تو ساری پوشیدہ حقیقتوں کے عالم ہیں۔

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں اس مضمون کی متعدد حدیثیں نقل کی ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "میرے اُمتی حوض کوثر پر میری طرف آتے آتے جہنم کی طرف لے جائے جائیں گے اور میں آواز دوں گا کہ ہاں ہاں یہ میرے امتی ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب دیا جائیگا۔ "انك لا تدري ما احدثوا بعدك" آپ نہیں جانتے کہ آپ کے بعد انہوں نے کیا کیا بدعتیں ایجاد کی تھیں"۔

مشرکین عرب جنہیں اپنے مورث اعلیٰ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہونے پر فخر تھا۔ ان کے تعمیر کیے ہوئے بیت اللہ کا آج بھی پوری عقیدت کے ساتھ حج کرتے اور انہیں ابراہیمؑ کے اس کارنامے پر بھی فخر تھا جو آپ نے نمرود جیسے حکمران کے شاہی بت خانہ کے بت توڑ کر انجام دیا ــــ لیکن اسی خانۂ خدا میں جو اس بت شکن نے ایک خدا کی پرستش کے لیے ساری دنیا کی خاطر تعمیر کیا اس کی اولاد نے اسی عبادت گاہ میں ایک دو نہیں تین سو ساٹھ بت نصب کر رکھے تھے جن میں خود ابراہیمؑ بت شکن کا بت بھی تھا اور ان کے فرزند اسمٰعیل علیہ السلام کا بت بھی نصب تھا۔

صاف ظاہر ہے کہ یہ طور طریقے ان لوگوں کے اپنے اختراع کیے ہوئے تھے جو ان کے گمراہ لوگوں نے ایجاد کیے تھے نہ کہ نیک آباؤ اجداد کے۔

اصل بات یہی ہے کہ اس سلسلہ میں زمان و مکان کو کوئی دخل نہیں۔ صرف انسان کا عمل اور عمل ہی ایک ایسی قوت ہے جو ہر شے پر غالب ہے۔ اور خدا کی بارگاہ میں قابل قبول۔ وقت یعنی زمانہ کی حقیقت معلوم کر چکے ہو۔ مکان کی حیثیت پر بھی غور کرو۔ بیت اللہ، بیت محرم

سے بڑھ کر کس مکان کو مکانیت کی صورت میں شرف و احترام حاصل ہو سکتا ہے لیکن انسانی عمل یا فعل نے اسے بھی بُت خانہ بنا لیا ـــ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

کوئی ناقوس اٹھا لاؤ ابھی بتلا دوں
دیر کیا لگتی ہے کعبے کو کلیسا بنتے

علامہ اقبال فرماتے ہیں:۔

تیرا جہاں ہے وہی جس کو تو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تیری نگاہ میں ہے

(تفصیل جشنِ میلاد کے جلوسوں کے ذکر اور شب معراج کے چراغاں وغیرہ کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیں)

۳۔عمل سے بے توجہی ہی اصل گمراہی ہے۔جس وقت تک کوئی قوم عمل کے شوق میں منہمک رہتی ہے، اس کا خیال کسی دوسری طرف منتقل نہیں ہوتا۔نہ اس میں اختلافات پیدا ہوتے ہیں اور نہ کوئی ضعف و اضمحلال۔صراط مستقیم کا ایک سے زیادہ ہونا ناممکن ہے اور جو فرد یا قوم صراط مستقیم سے بھٹکی اس کے سامنے لامتناہی راہیں لازماً آجائیں گی۔ وہ اس ہلاکت انگیز تباہی سے نہیں بچ سکتی۔

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

۴۔کسی دن میں دن ہونے کی حیثیت سے نحوست یا برکت کا ہونا بداہتہً خلافِ عقل ہے۔لیکن باوجود اس کے تقریبات منانے والے لوگوں نے اس جھوٹ کو ایسا سچ سمجھ کر قبول کیا ہے کہ اس کے مقابلے میں سچ کو جھوٹ قرار دے دیا گیا۔اس فریب خوردگی کے کچھ نفسیاتی اسباب ہیں۔انسان طبعاً کام اور کام کی مشقت سے دل چراتا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کی تعریف و تحسین بھی ہوا کرتی رہے۔اور کام بھی نہ کرنا پڑے بالخصوص جب کوئی قوم انحطاط کے دَور میں ہوتی ہے تو پھر یہ بدخصلت اس میں ایسی قوت

سے نمودار ہوتی ہے جس سرعت سے وہ عمل سے جی چراتی چلی جاتی ہے۔ یہود کے متعلق بلکہ یہودلیڈروں اور رہنماؤں کے متعلق قرآن حکیم کا حکم ہے: یُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا (یہ لوگ چاہتے ہیں کہ کریں کچھ نہ اور ان کی تعریفیں ہوتی رہیں) ایسے کام چور لوگ صرف لہو لگا کر شہیدوں میں نام لکھوانے کے آرزومند ہوتے ہیں۔ اس لیے ایسی سستی شہرت صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ سرے سے عمل کے وجود ہی سے انکار کیا جائے شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر، کھلم کھلا ہو یا حیلوں بہانوں سے، تاکہ نہ اگے بانس اور نہ بجے بانسری۔ چنانچہ اس کا آسان طریقہ یہی ہے کہ کسی دن ہی کو بابرکت سمجھ لیا جائے تاکہ اس دن کا دن ہونا، وہ معین تاریخ اور اس تاریخ پر طلوع ہونے والا سورج اپنے طلوع کے ساتھ ہی خود بخود سعادتیں اور برکتیں لے کر آجائے اور انہیں بھی وہ دن اپنی ذاتی برکات سے بہرہ مند کر جائے۔

طوفانِ نوح ؑ ایک طرف منکرینِ حق کو غرق کر رہا ہے۔ باپ (نوح ؑ) اس وقت بھی بیٹے کو دعوتِ حق دیتا ہے اور مؤمنین کے ساتھ شامل ہو جانے کی رہنمائی کرتا ہے یٰبُنَیَّ ارْکَبْ مَّعَنَا (بیٹا! ہمارے ساتھ مل کر کشتی میں سوار ہو جاؤ) لیکن بیٹا اپنی پارٹی کو نہیں چھوڑتا اور مادی وسائل کے سہاروں کی امید پر کہتا ہے: سَاٰوِیْٓ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ (میں عنقریب پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر پناہ لے لوں گا جو مجھے طوفان کی ہلاکت خیزیوں سے بچائے گا) لیکن پیغمبر کس وثوق سے کہتا ہے: لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ (یہ سب کچھ اللہ کے حکم سے ہو رہا ہے آج اس سے بچانے والا کوئی نہیں) البتہ دوسری طرف اسی ہمہ گیر طوفان میں پہاڑ کی چٹان کی طرح کشتی مومنوں کی حفاظت کر رہی ہے۔ یہ دن نحس ہے تو سب کے لیے کیوں نحس نہیں اور سعد ہے تو سب کے لیے کیوں نہیں؟

اسرائیلیوں کی چار صد سالہ مصری تاریخ کے ایک ایک واقعہ پر غور کرو کس طرح ذلت و نکبت کی گہرائیوں میں گرتے چلے گئے ہیں۔ آخر یہاں تک ذلیل ہو گئے۔ کہ علانیہ ان کے بچے ذبح کیے گئے لیکن وہ زبان سے بھی احتجاج نہ کر سکے۔ آخر ایک ہی دن ایسا آیا اور واقعی وہ

ایک ہی دن تھا جس میں خدائی دعویٰ کرنے والا طاغوت صفت رسولئے زمانہ ظالم حکمران فرعون وقت اپنے لاؤ لشکر سمیت غرق ہوتا ہے اور اس کی اس عبرت ناک ہلاکت پر نہ آسمان کو افسوس ہوتا ہے نہ زمین کو رونا آتا ہے۔ ہاں وہی دن اسرائیلیوں کی ذلتوں کے خاتمے کا دن تھا اور ان کی صدیوں کی غلامی کے بعد آزادی کا نوروز۔

یاد رکھو! یہ دنوں کی نحوست و برکت کا اثر اور نتیجہ نہیں، انسانی اعمال کے نتائج اور ان کی سزا و جزا کا فیصلہ کرنے والی اصل قوت قدرتِ خداوندی کی قوتِ متصرفہ ہے۔ جو قوت اپنی پیدا کی ہوئی طاقتوں سے جو کام چاہے اور جس وقت چاہے لے لے۔

۵۔ ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچنے کے لیے سیدھا راستہ ایک اور صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ ایک کے علاوہ باقی سب راستے خواہ کسی قدر بھی تجویز کرنے کی کوشش کی جائے۔ سب ٹیڑھے ہوں گے جنہیں غیر متناہی ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کی مثال بڑی آسان صورت میں یوں سمجھیئے کہ ایک نقطہ نیچے لگا دیجیے اور دوسرا اوپر اور پھر ان دونوں نقطوں کے درمیان ایک خط کھینچیے جو نیچے سے اوپر کو چلا جائے، یہ خط یقیناً ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے ارد گرد جتنے خط بھی آپ ایک نقطہ سے کھینچ کر دوسرے نقطہ سے ملائیں گے وہ سب سیدھے نہیں ہوں گے۔ مثال دیکھیے۔
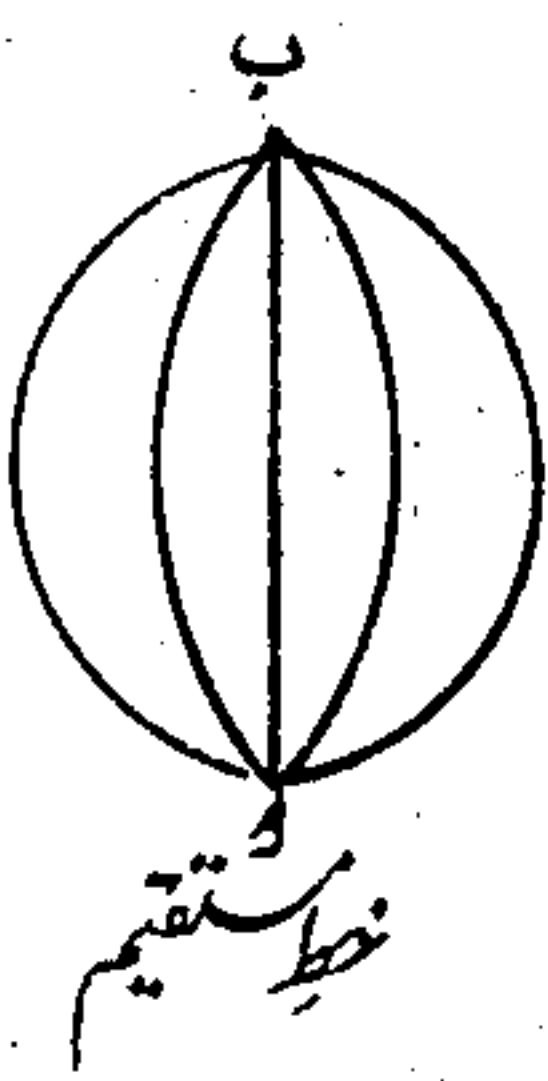
ب

د

خطِ مستقیم

اب سمجھیے کہ اگر خدا خدا ہے اور بندہ بندہ تو خدا کی رضا تک رسائی حاصل کرنے کے لیے سیدھا طریقہ ایک ہی خطِ مستقیم طریقہ ہو سکتا ہے۔ ایک سے زیادہ سب باطل ہوں گے اور یہ طریقہ اسی ایک صورت ہی میں محفوظ رہ سکتا ہے کہ ساری کائنات میں صرف ایک خدا ہی کی قوت کو متصرفہ قوت تسلیم کیا جائے۔ اگر خدا کے بغیر کسی ایک قوت میں بھی تصرف کا اختیار تسلیم کر لیا گیا تو صراطِ مستقیم سے ہٹ گیا۔ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ ۔ ۔ ۔ ۔ چہ جائیکہ دنوں اور تاریخوں میں سعادت و نحوست تسلیم کر کے ان کے تصرف پر ایمان لے آیا جائے۔ جو خود سورج کی پیداوار اور سورج کے طلوع و غروب کے محتاج ہیں اور پھر سورج

آپ اپنے طلوع و غروب اور زوال و کمال میں محض بے بس اور اپنے پیدا کرنے والے کے دستِ قدرت میں بے اختیار ہے۔ کتنے صاف الفاظ میں فرمایا ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۚ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝

اور جہاں اور بہت سی نشانیاں ہیں خدا کی قدرت کی نشانیوں میں سے رات اور دن، سورج اور چاند بھی ہیں۔ تو لوگو! نہ تو سورج کو سجدہ کرنا اور نہ چاند کو اور اگر تم کو خدا کی عبادت کرنی ہے تو اللہ ہی کو سجدہ کرنا جس نے ان چیزوں کو پیدا کیا ہے۔

پھر فرمایا: وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ

اور کشتیوں کو تمہارے اختیار میں کر دیا۔ اور اسی طرح سورج اور چاند کو تمہارے اختیار میں کر دیا کہ دونوں پڑے چکر کھا رہے ہیں اور ایسا ہی رات اور دن کو تمہارے اختیار میں کر دیا۔ اور جو کچھ تمہارے درکار تھا بقدرِ مناسب تم کو دیا۔

قرآن حکیم نے بار بار یقین دلایا ہے کہ اجرامِ سماوی ہوں یا اجسامِ ارضی، کائنات کا ذرہ ذرہ تیرا خادم و فرماں بردار ہے۔ رات تیری راحت و سکون کے لیے ہے اس میں چوری اور زنا جیسے جرائم بھی کر سکتا ہے اور سکون و خاموشی کی فضا سے فائدہ اٹھا کر پوری یکجہتی سے نماز کا حضور اور تہجد کا سرور بھی حاصل کر سکتا ہے۔ اسی طرح دن تجھے طلبِ معاش کی سہولت مہیا کرتا ہے، خواہ اس طلب و تلاش کا رُخ جائز ذرائع کا پابند رہ کر حلال روزی کما لے خواہ ناجائز ذرائع اختیار کر کے حرام روزی حاصل کر لے۔ بہرحال دن بھی تیری خدمت انجام دینے کے لیے ہے اور رات بھی اپنے ارادے اور عمل سے ان خادموں کو چاہے تو اپنے حق میں منحوس اور نارشید بنا لے اور چاہے تو مبارک اور رشید۔

یہی وہ مقامِ خلافتِ الٰہیہ اور امتِ واحدہ کی صورت ہے جہاں بندہ صرف خدا کا بندہ ہو اور باقی مخلوق انسان کی خدمت گزار۔ خلافت اور نیابتِ الٰہی کے یہی معنی ہیں اس مقام

پر وقت، موسم اور دن اور ان مادی محرکات سے پیدا ہونے والے رسوم و عادات کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔ ؎

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدہ سے دیتا ہے آدمی کو نجات

کسی اللہ کے بندے نے اس سے بھی واضح الفاظ میں کہا ہے : ؎

کسی کا آستاں اتنا ہے اونچا
کہ سر جھک کر بھی اونچا ہی رہے گا

۶۔ اپنے گناہوں کو دوسروں کے سر مقوپنے کی عام عادت یا خواہش جو قریب قریب ہر آدمی میں پائی جاتی ہے، اسی بنا پر نسل پرست اور خدا فراموش لوگوں نے ہوائے نفس کے تحت بد رسمیاں پیدا تو خود کیں لیکن بد نام اپنے آباؤ اجداد کو کیا۔

اس بد رسمی کی ایک یہ صورت بھی تھی کہ اپنے نیک، راست ازم اور حق پرست آباؤ اجداد کی پیروی کو ترک کر دیا اور ان آباؤ اجداد کی تقلید و اتباع کا سہارا لے لیا جو بُرے طریقوں کے موجد تھے اور انبیاء کرام یا داعیانِ حق راہنماؤں کی دعوت کے جواب میں بڑے فخر سے کہہ دیا۔ کہ حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا۔

قرآن حکیم نے ان رسوم پرستوں کی فریب خوردگی یا کٹ حجتی اور خود فریبی کا ایسا جامع سنجیدہ متین اور مُسکت جواب دیا جس کا کوئی جواب نہ تھا۔ عرب کے نسل پرست مُشرک اسمٰعیلیوں کے لیے بھی اور یہود و نصاریٰ کہلانے والے مذہب سے زیادہ نسل کے پرستار اسرائیلیوں کے لیے بھی قرآن حکیم کا یہ جواب ایک جیسا لاجواب تھا۔ اگر یہ لوگ اپنی برائیوں اور بد عقیدگیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے بد نیتی سے اپنے آباؤ اجداد کا نام استعمال کرتے تھے، جب بھی اور اگر وہ واقعی نیک نیتی سے اس فریب میں مبتلا تھے کہ بڑوں کے طریقے چھوڑ کر خود ان کی حماقت کا اعتراف کیوں کریں، جب بھی، دونوں صورتوں میں ان ہر دو پارٹیوں کو ان کے مُسلّم جد امجد حضرت

ابراہیم علیہ السلام کے ان واقعات کی طرف توجہ دلائی جن واقعات سے بچہ بچہ واقف ہی نہ تھا بلکہ اُن کو ان پر فخر تھا۔

سورۂ انعام کے رکوع ۹ کی آیت وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اور جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ آزر سے کہا سے لے کر ابراہیمؑ کا اپنے آباء کی تقلید سے انکار، باپ اور اس کی ساری قوم کو صریح گمراہ کہہ کر ان کے طرزِ زندگی کی پیروی سے انکار، معاشی اور معاشری رسوم کے علاوہ ان کی ستارہ پرستی کے مذہبی عقیدہ سے انکار، ستارے، چاند حتیٰ کہ نظامِ شمسی کی مرکزی قوت سورج دیوتا کی خدائی سے انکار اور اس سلسلہ میں وہ عالی شان قربانی کہ ملک کے سب سے بڑے بلکہ نمرود جیسے وقت کے حکمران کے لیے بھی قابلِ صد احترام مذہبی پیشوا اپنے باپ آزر کی بنی ہوئی پیشوائی کی سب سے اونچی گدی کی موروثی قیادت کی عیشوں اور آسائشوں سے انکار اور ان سب راحتوں کے مقابلہ میں باپ سے لے کر حکومتِ وقت سمیت ملک کے بچے بچے کی مخالفت کی جان کاہ اذیتوں کے قبول کرنے کی تفصیل بیان کر کے قرآن نے ان کے صرف خدائے واحد کی حاکمیت کے سچے اعتراف کا ذکر فرمایا ہے۔ اور پھر ابراہیمؑ کے اس ہمہ گیر انکار اور محض ایک ذاتِ واحد کی قوت کے اعتراف و اقرار کا وہ سادہ اور سیدھا فلسفہ اور بے خوفی کا سبب جو ابراہیمؑ نے قوم کے سامنے بیان کیا کہ (اور آخر میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے کیسے ڈروں، جب کہ تم اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو خدائی میں شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لیے اس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی؟) کس باوقار اور دل نشین انداز میں بیان فرمایا ہے۔

اس کے بعد فرمایا:

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ

یہ تھی ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم کے مقابلہ میں عطا کی ہم جسے چاہتے ہیں بلند مرتبے عطا کرتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ تمہارا رب

نہایت دانا اور علیم ہے۔

غرض بڑی وضاحت سے قابلِ فخر قومی روایات کی روشنی میں اسمٰعیلیوں اور اسرائیلیوں کے مورثِ اعلیٰ کی مقدس زندگی کے مشہور واقعات کی شہادت پیش کر کے فرمایا کہ باپ دادا کی تقلید ضروری نہیں۔ تمہارے نیک نام مورثِ اعلیٰ نے آباؤ اجداد کی اندھی تقلید کر کے ابدی عزت اور ناموری حاصل نہیں کی بلکہ انکار کر کے حاصل کی ہے اور تمہیں بھی اس کے انکار کے کارنامے پر ہی فخر ہے۔

آخر بہت سے مشہور انبیائے کرام کے نام لے کر اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ آخر یہ لوگ بھی تو تمہارے باپ دادا ہیں۔ ان کی پیروی کیوں نہیں کرتے؟ اگر آباؤ اجداد ہی کی پیروی پر تمہیں اصرار ہے تو اپنے ان باپ دادوں کی پیروی کرو۔

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ؕ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِىْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّاۤ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ۝

پھر ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ جیسی اولاد دی اور ہر ایک کو راہِ راست دکھائی۔ (وہی راہِ راست جو) اس سے پہلے نوحؑ کو دکھائی تھی اور اسی کی نسل سے ہم نے داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ کو (ہدایت بخشی) اس طرح ہم نیکوکاروں کو ان کی نیکی کا بدلہ دیتے ہیں (اسی ابراہیمؑ کی اولاد سے) زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ اور الیاسؑ کو (راہ یاب کیا) ہر ایک ان میں سے صالح تھا۔ (اسی کے خاندان سے) اسمٰعیلؑ، الیسعؑ

اور یونس ؑ اور لوط ؑ کو راستہ دکھایا ، ان میں سے ہر ایک کو ہم نے تمام دنیا والوں پر فضیلت عطا کی ۔ نیز ان کے آباؤ اجداد اور ان کی اولاد اور ان کے بھائی بندوں میں سے بہتوں کو ہم نے نوازا ۔ انہیں اپنی خدمت کے لیے چن لیا اور سیدھے راستے کی طرف ان کی راہنمائی کی ۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے جس کے ساتھ وہ اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتا ہے راہ نمائی کرتا ہے ۔ لیکن اگر کہیں ان لوگوں نے شرک کیا ہوتا تو ان کا سب کیا کرایا غارت ہو جاتا ۔ یہ وہ لوگ تھے ۔ جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت عطا کی تھی ۔ اب اگر یہ لوگ اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں تو (پرواہ نہیں) ہم نے کچھ اور لوگوں کو یہ نعمت سونپ دی ہے جو اس کے منکر نہیں ہیں ۔ اے محمد ! وہی لوگ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے ، انہیں کے راستہ پر تم چلو ، اور کہہ دو کہ میں (اس تبلیغ و ہدایت کے) کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں ، یہ تو ایک عام نصیحت ہے تمام دنیا والوں کے لیے ۔

۷ ۔ اب دیکھو کہ ان اسمٰعیلیوں اور اسرائیلیوں کو جب قرآن حکیم نے خود ان کے اپنے اختیار کیے ہوئے طریقہ ہی کی پیروی کی دعوت دی کہ اپنے آباؤ اجداد ہی کے طریقہ پر چلو اور کہا گیا کہ یہ لوگ بھی تمہارے ہی آباؤ اجداد ہیں آخر ان کی پیروی کیوں نہیں کرتے تو ایسی صاف راہ سے انکار کے لیے ان کے پاس سوائے اس کے کوئی گنجائش نہ تھی کہ فواحش کو بھی نعوذ باللہ خدا کا حکم قرار دے دیتے ۔ اسی بنا پر صاف کہہ دیا ۔ وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا (اعراف ۔ ۳)

یاد رہے کہ اسلام کا یہ دعوت دینا کہ اپنے نیک آباؤ اجداد کی پیروی کرو ۔ کوئی عام بات نہیں ایک بنیادی اصول پر یہ حکم دیا گیا ہے ۔ وہ یہ کہ اسلام گناہ کو انسان کی موروثی وراثت نہیں مانتا ۔ نہ انسان کو پیدائشی گنہ گار قرار دیتا ہے ۔ بلکہ اسے احسن تقویم پر پیدا ہونے والی مخلوق بتلاتا ہے ۔ انسانی نسل آدم ؑ سے چلی اور آدم علیہ السلام پیغمبر تھے ۔ عام انسان تو رہا ایک طرف ۔ سو اگر آخری سے آخری مورث اعلیٰ کی بھی پیروی کی جائے تو ہدایت ہی حاصل ہو گی اور یہ ایک پیغمبر کی پیروی ہو گی ۔

(۲) دو بے حقیقت "حقیقتیں" ——— نسل پرستی اور تقلیدِ آبا

کسی بے حقیقت شے کو حقیقت تسلیم کر لینا ایسی غلطی ہے جس کا مرتکب اپنے سفرِ زندگی کا پہلا قدم ہی منزل کی مخالف سمت اٹھا لیتا ہے۔ اس کی جدوجہدِ حیات اس کے اپنے خلاف ہی ہو گی جس قدر تیز رو ہو گا اسی قدر تیزی سے منزل سے دُور ہوتا چلا جائیگا۔

نسل پرستی ایک بے حقیقت شے ہے۔ اسے موجودہ انسانی معاشرے نے حقیقت تسلیم کر کے ایک ایسی نئی دنیا آباد کر لی ہے کہ جسے نسلِ آدم سے آباد ہونے والی دنیا سے علیحدہ کوئی دنیا کہہ لیا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ یہ وہ دنیا نہیں جسے یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ کہہ کر پکارا جا سکتا ہو اور وہ یک زبان ہو کر ایک ہی آپ کے بیٹوں کی حیثیت سے ایک ہی ربّ کو یکساں صورت میں لبّیک کہہ سکیں۔

اسی طرح باپ دادا کی تقلید کا عقیدہ بھی بالکل بے حقیقت اور بے بنیاد تصور ہے جسے اپنی آباد کی ہوئی دنیا والوں نے اپنا اصولِ زندگی قرار دے لیا ہوا ہے۔ ایک خود ساختہ موہوم دنیا میں اپنا تجربہ کیا ہوا عقیدہ اختیار کر لینا وہم در وہم یا ظلمات بعضہا فوق بعض کی حیثیت سے کم نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی خواب دیکھنے والا خواب میں خواب دیکھ رہا تھا۔

دنیا خوابے و آں چہ بینی در وے
خوابیست کہ در خواب بہ بینی اُو را

حضرت ابراہیم علیہ السلام بُت شکن کی تعمیر کردہ مسجد (بیت اللہ) میں تین سو ساٹھ بُت نصب کرنے والی ان کی برگشتہ بخت اولاد کا یہ خود ساختہ عقیدہ انتہائی بدقسمتی تھی۔ اس منفی صورتِ حال نفی ہی سے مثبت پہلو سامنے آ سکتا تھا اور ان کی قسمت جاگ سکتی تھی۔ کیونکہ منفی کی نفی ہی مثبت ہو سکتا ہے۔

انقلابے بہ غم آباد جہاں مے خواہم
شاید ایں طالع برگشتۂ من برگردد

اسی طرح بے حقیقت شے کو حقیقت یقین کرنے والے جب ہی حقیقت کو پا سکتے ہیں۔ کہ اپنی مزعومہ اور متصورہ حقیقت کو بے حقیقت یقین کر لیں۔ ان میں دو چیزیں حسب ذیل ہیں۔ جو ہمارے غیر اسلامی معاشرے میں رواج پا چکی ہیں۔

۱۔ غرورِ نسل

۲۔ باپ دادا کی تقلید

یہ وہ فریبِ نفس ہے جس سے خود ابلیس فریب دینے والا بھی بچ نہیں سکا۔
دنیا والے جس چیز کو جو چاہیں سمجھ لیں، لیکن کسی شے کو اپنے خیال کے مطابق کچھ سمجھ لینے سے شے کی اصل حقیقت تبدیل نہیں ہو جاتی اور اسی فریب خوردہ دماغ کی یہ خود فریبی اسی نگوں بخت کو نقصان دے گی جس نے اپنی غلط اندیشی کی بنا پر غلط کو صحیح دشمن کو دوست، زہر کو تریاق اور پسے ہوئے سنکھیا کی پڑیا کو کھانڈ سمجھ کر پھانک لیا ہے۔ زہر یقیناً اپنا کام کرے گا اور غلط فہم کی غلط فہمی کو قطعاً معاف نہیں کرے گا خواہ سمجھنے والے نے فی الواقع پوری ایمان داری سے ایسا سمجھا ہے۔ عارفِ روم رح نے اُن ہلاک ہونے والی تمام قوموں کے متعلق جو اپنے بد اعمال کی بنا پر مختلف ارضی و سماوی عذابوں میں مبتلا ہو کر تباہ و برباد ہوئی ہیں۔ ایک ہی فیصلہ دیا ہے کیونکہ ان کا گناہ یا جرم بھی ایک ہی تھا۔

بر ہلاکِ امت پیشیں کہ بود
زانکہ بر جندل گماں بردند عود

(ہلاک ہونے والی پہلی امتوں میں ہر امت کی ہلاکت کا سبب یہی تھا کہ وہ پتھر کے ٹکڑے کو عود سمجھتے رہے)

انسانی معاشرے میں یہ دو غلط فہمیاں ہمیشہ سے ایک جیسی چلی آ رہی ہیں۔
ایک نسلی اونچ نیچ کے مغالطے کی غلط فہمی۔
دوسرے اپنے آباؤ اجداد کے اختیار کیے ہوئے رسوم و آداب اور طور طریقوں کی پیروی ہی کو درست سمجھنے کی غلط فہمی۔
ہر بگڑے ہوئے معاشرے میں یہ دو غلط فہمیاں حقیقت بن کر سامنے آئیں، ہمیشہ آتی رہیں اور آئی ہوئی ہیں۔ حالانکہ ان دو واہموں سے بڑھ کر بے حقیقت واہمہ شاید ہی کوئی ہو۔ نہ نسلی اونچ نیچ کے تصور کی کوئی حقیقت ہے اور نہ آباؤ اجداد کی اندھی تقلید کی بنیاد ہی کسی عقلی اور نظری حقیقت پر مبنی قرار دی جا سکتی ہے۔ اس لیے دونوں بے حقیقت ہیں جنہیں حقیقتیں قرار دے لیا گیا ہوا ہے۔

ا۔ عنصر و نسل

اسلام ایک حقیقت پسند دینِ فطرت ہے۔ اس نے نیکی بدی، سعادت و نحوست، ثواب و عذاب اور انسانی زندگی کی ناکامی و کامیابی کا دارومدار اور انحصار صرف عمل پر رکھا ہے جس پر انسان کو عقل و شعور دے کر اختیار بھی دیا۔ اور اسے اپنے کیے کے نیک و بد کا ذمہ دار بنایا۔ اس لیے ایسی اتفاقی چیزیں جو انسان کے بس کی نہیں، ان پر اس کی قیمتی زندگی کے انجام کو نہیں چھوڑا۔

ا۔ کسی دولت مند کے گھر میں پیدا ہونا اور غریب گھر میں پیدا نہ ہونا، انسان کے اپنے اختیار میں نہیں۔ ایسے ہی اونچ نیچ کے غلط تصور کے تحت کسی "معزز" خاندان میں جنم لینا اور ذلیل سمجھ لیے گئے ہوئے گھر میں پیدا ہونے سے بچ جانا بھی کسی پیدا ہونے والے بچے کے بس کا روگ نہیں جس پر اسے مجرم قرار دے کر حقارت کی نظر سے دیکھا جائے یا معزز سمجھ کر بچپن ہی سے اسے سلام کیا جائے اور ہر حال میں ساری عمر معزز ہی سمجھا جاتا رہے۔

۲- یہ مشاہدہ ہے کہ کئی غریب گھروں میں پیدا ہونے والے بچّے بڑے بڑے دولت مند بن گئے، بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ کئی لاوارث بچے دولت مند ہی نہیں، تخت و تاج کے مالک اور وارث بنتے رہے۔ دنیا کے فاتح اعظم اسکندر کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ فیلقوس نے اسے جنگل میں مُردہ پڑی ایک نامعلوم عورت کے سینہ پر سے دُودھ چوستے اٹھایا تھا۔

۳- دولت مندوں سے غریب، غریبوں سے دولت مند، جاہلوں سے عالم، عالموں سے جاہل، دانشمندوں سے احمق، احمقوں سے دانش مند، محکوموں سے حاکم، حاکموں سے محکوم، حتّٰی کہ نبیوں سے کافر، کافروں سے نبی پیدا ہوتے چلے آئے ہیں۔ اس سے بڑھ کر غرورِ نسل کی بے حقیقتی کا کھلا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟ جسے جاہلوں نے حقیقت سمجھ رکھا ہے۔

۴- اس جاہلانہ عقیدہ سے جہالت ہی پھیل سکتی ہے اور ایک جاہل، ناحق شناس اور استحصالی معاشرہ ہی وجود میں آسکتا ہے۔ جس میں عمل اور حُسنِ عمل جیسے شرفِ انسانی کو کوئی وزن حاصل نہ ہوگا، نیک و بد کی تمیز نہ ہوگی حتّٰی کہ کفر و ایمان جیسی حقیقت کو بھی اس بے حقیقت تصور اور غرورِ نسل کے واہمہ کے مقابلے میں بے ضرورت سمجھ لیا جائے گا۔

۵- ابتدائے آفرینش ہی کے وقت ابلیس نے اپنی نسل کی بلندی پہ فخر کیا۔ اپنے آپ کو ایک گُونہ بڑے باپ کا بیٹا سمجھا اور کہا، خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ ؕ (باری تعالیٰ! تُو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس (آدم) کو مٹی سے) ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِیْنًا ؕ (کیا میں اسے سجدہ کروں جسے تُو نے مٹی سے پیدا کیا ہے؟) آگ مٹی کے مقابلے میں ایک جوہر لطیف ہے۔ مٹی اور مٹی سے پیدا ہونے والی ہر شے اوپر کی طرف اُچھالنے پر بھی نیچے کو آتی ہے اور آگ رکاوٹوں کے باوجود بھی اوپر ہی کا رُخ کرتی ہے۔

دوسری جانب آدمؑ نے جو شرف و مجد حاصل کیا اس کا دارومدار عمل پر رکھا گیا۔ انبیائے کرامؑ کی بعثت کا مبارک سلسلہ، کفر و ایمان کے امتیاز کا سارا انحصار، جزا و سزائے تمام فطری، تکوینی اور تشریعی ضابطے اور قوانین، غرض کائنات کا سارا نظام، عمل اور پاداشِ عمل پر منحصر ہے۔

اس لیے نسل کے اختلاف کو وزن دینا بلکہ سرے سے اس کو اختلاف کا نام یا رنگ دینا ہی ایک ایسی بے حقیقت وہم پرستی ہے جسے حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

۶۔ قرآن حکیم نے اس انتہائی خطرناک، نقصان دِہ اور فساد انگیز مغالطے اور غرورِ نسل کے اس فریب کو جس فریب سے خود ابلیس بھی نہیں بچ سکا۔ نہایت آسان اور انتہائی قریب الفہم طریقے سے بیان فرمایا ہے۔ سورۃ نساء، آیت نمبر ا۔ رکوع نمبر ا میں حکم ہے:۔

"لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیئے اُس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو اور رشتہ و قرابت کے تعلقات بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔"

فرمایا، تمام انسان ایک نفسِ واحدہ آدمؑ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس لیے کسی ایک شخص کا دوسرے سے کسی علیحدہ نسل سے متعلق ہونے کا سوال ہی سرے سے بے حقیقت ہے۔ سب کا مورثِ اعلیٰ ایک ہے۔

اگر کسی غلط فہم کوتاہ اندیش نے آدمؑ سے نیچے اپنے کسی مشہور باپ دادا کی حکومت، دولت، عقل و دانش یا کسی ملک کی فرماں روائی غرض کسی ایسی ہی امتیازی نسبت کی وجہ سے بڑا سمجھ کر اپنی ایک علیحدہ نسل، علیحدہ خاندان اور علیحدہ ذات گوت کا دعویٰ کر کے اس مورث کے نام ہی کو نسل، ذات یا خاندان کا نام دے لیا ہے جیسا کہ

رواج چلا آرہا ہے تو اسے سب سے پہلے حسب ذیل صرف ایک بات پر غور کرنا چاہیئے:-

کیا اس کا یہ مورث جس کی اولاد ہونے پر فخر کر رہا ہے، خواہ کسی بھی امتیازی شان کی بنا پر کر رہا ہو، ابوالبشر، ابوالانبیاء، خلیفۃ اللہ، مسجودِ ملائک، خدا کے سب سے پہلے نبی حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے وہ کس فضیلت میں برتر ہے؟ یا برتر ہو سکتا ہے؟ جس کی وجہ سے وہ آدم کا بیٹا ہونے اور کہلانے سے تو شرم اور ننگ محسوس کرتا ہے لیکن نمرودوں، فرعونوں، قارونوں کا بیٹا کہلانے پر فخر کرتا ہے۔ یا کل کے ہو گزرنے والے شہنشاہِ ایران کی طرح مسلمان کہلانے کے باوجود اپنے مورث اعلیٰ داراب کے باپ بہمن بن اسفندیار کی نسل ہونے پر اترانا ضروری سمجھتا ہے جس نے اپنی حقیقی بیٹی ہما کو بیوی بنایا اور اسی سے اس کا بیٹا داراب پیدا ہوا، یہی بہمن داراب کا باپ بھی تھا اور نانا بھی۔

یہ سب نسل کی حفاظت اور نسل پرستی کے نتائج ہیں۔

اگر نسل پر فخر کرنا کوئی معنی رکھتا ہے تو آدمؑ کا بیٹا کہلانے سے بڑھ کر فخر کا کونسا مقام ہو سکتا ہے؟ — لیکن دوسرے بنی نوع سے بالاتر بننے کی ہوس بے جا جب کسی کم اندیش آدم زاد کو اندھا کر دیتی ہے تو آدمؑ نبی کا فرزند کہلانے کے بجائے کسی مجہول الحال کا بیٹا کہلانا پسند کر لیتا ہے۔ دوسرے سے بڑا بننا تو ہے ہی امر محال، اس طرح وہ شرف آدمیت کا اصل اعزاز بھی کھو بیٹھتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انا سید ولد آدم فرما کر ساری اولاد آدمؑ کا خود کو سردار فرمایا؛ لیکن آدمؑ کی فرزندی کے اقرار ہی کو پسند کیا اور پھر اس پر بھی ولا فخر کہہ کر نسل کے فخر کو بے حقیقت قرار دے دیا۔

غرض یہ غلط تصور محض واہمہ اور ایک بے حقیقت صریح جہالت پر مبنی ایک بے بنیاد داعیہ ہے جسے عزت کا نشان سمجھ کر ایک جاہلانہ بے عزتی کو قبول کر لیا گیا ہے۔

،۔ قرآن کریم نے پانچ چھ مرتبہ فرزندانِ آدم کو بڑے پُروقار انداز میں "یا بنی

آدم! کہہ کر خطاب کیا ہے اور اس کے اشرف المخلوقات ہونے کا اعلان فرمایا ہے لیکن جن لوگوں نے وہ زمین ہی تبدیل کر دی ہوئی ہے جس پر بنی آدم آباد تھے اور یہاں بنی آدم کہلانے والا کوئی موجود ہی نہ ہو وہاں اس خطاب پر لبیک کون کہے گا؟

ایک معنی خیز لطیفہ

میں ایک دعوتِ ولیمہ میں شریک تھا، علاقہ کی زمیندار برادری کے اکثر قابلِ ذکر معززین جمع تھے۔ قریبی گاؤں کا ایک مراسی جو ہمیشہ میرے پاس آنے والا تھا۔ قنات کے اندر آیا سامنے کھڑا ہو کر "دعا سیس" کی حسبِ معمول اسے کچھ دے دیا۔ لیکن ساتھ ہی میں نے اسے قریب کی ایک خالی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ بھلا اس ماحول میں اسے کرسی پر بیٹھنے کی جرأت کس طرح پڑ سکتی تھی۔ میرے اس غیر معمولی اصرار اور اس کے دہشت و معذرت سے ملے جُلے انکار کو ساری مجلس متجسس نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ یہ سب لوگ میری طبیعت سے واقف تھے۔ کہ میں ایسی مجلسوں میں عموماً تقریبِ سخن پیدا کر لیتا ہوں اور بالخصوص غرورِ نسل کے بے حقیقت تصور کی قلعی کھولنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ میراسی میری بات بھی رد نہ کر سکتا تھا اور اس کے لیے کرسی پر بیٹھنا بھی ناممکن تھا۔ آخر ٹیڑھا ہو کر جسم کا بہت تھوڑا سا حصہ کرسی سے لگا کر ایک گونہ شرط پورا کرنا چاہی۔ ابھی پوری طرح ایسا بھی نہ کر پایا تھا کہ اچانک اس کے اپنے گاؤں کے ایک مشہور چوہدری صاحب سامنے آ گئے، چوہدری صاحب تو مجھ سے مصافحہ کر رہے تھے لیکن مراسی کی حالت یہ ہوئی کہ گویا اسے بجلی کے کرنٹ نے کرسی سے نیچے گرا دیا ہے۔

اب اس موضوع پر گفت گو کے لیے اور بھی زیادہ موزوں موقع پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں نے اس پر مفصل تقریر کی۔ تمام اہلِ مجلس جن میں اکثریت واقف لوگوں کی تھی، تائید و تصدیق ہی کرتے رہے۔ درحقیقت یہ مسئلہ ہی لاجواب ہے۔ البتہ ایک طرف ایک ناواقف تعلیم یافتہ نوجوان جو بعد میں معلوم ہوا کسی کالج میں پروفیسر ہیں۔ مجھے مخاطب ہو کر کہنے لگے، آپ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں؟ میں نے سوال کے انداز سے اندازہ کیا کہ کسی خاندان کا نام لینے پر مجھ سے ضرور کچھ نہ کچھ پوچھیں گے۔ میں نے جواب دیا کہ میں

آدم علیہ السلام کے بڑے بھائی کی اولاد سے ہوں۔" سب پڑھے لکھے لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ نوجوان سائل بڑی سادگی سے فرمانے لگے کہ "آدم کے بڑے بھائی کہاں تھے؟" میں نے کہا: تو پھر آپ کو اس سوال کی ضرورت ہی کیا پڑی؟

وجہ بے گانگی نہیں معلوم　　　　تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

یہ ہے اس بے حقیقت واہمے کی حقیقت جسے اصل پر نگاہ نہ رکھنے والے درمیانی گمراہ لوگوں نے گمراہی سے حقیقت سمجھ رکھا ہے اور عمل کی حقیقی دنیا سے نکل کر فریب نفس کے سراب میں بھٹک رہے ہیں۔

۲۔ تقلید آباء

دوسرا بے حقیقت واہمہ جس نے ہمیشہ ہر معاشرے میں دینی حیثیت سے بدعقیدگی کو رواج دیا اور جس غرور نسل نے معاشرتی توازن اور اخلاقی نظام کو تباہ کر کے دنیا کے امن و اطمینان کو برباد کیا ہے، اس سے بھی بڑھ کر دنیا اور اس کے ساتھ عاقبت کو بھی ان لوگوں نے برباد کیا جنہوں نے اصلیت اور بنیاد کو فراموش کر کے بڑوں کے نام پر خود ساختہ رسوم و رواجات کی اندھی تقلید اختیار کر لی اور ان رسوم کے مقابلے میں انبیائے کرام کی مخلصانہ ہدایات اور مربیانہ اصلاحات کو بھی قبول نہ کیا۔ قرآن حکیم نے ساری انسانی تاریخ کا خلاصہ بیان فرمایا ہے:

> "ان لوگوں کو جب بھی کہا گیا کہ آؤ اللہ کے نازل کیے ہوئے احکام اور اتباع رسول کی طرف۔ تو کہا کہ ہمیں وہی طریقہ بس ہے، جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔" (سورہ مائدہ ۱۰۴)

گویا جب بھی وقت کے کسی پیغمبر نے لوگوں کو حق کی دعوت دی ہے ان کا یہی جواب تھا کہ ہمیں ہمارے باپ دادا کا طریقہ ہی کافی ہے۔

ا۔ قرآن حکیم نے اس بے حقیقت مغالطے اور گمراہی کو دور کرنے اور راہ ہدایت

دکھانے یا یاد کرانے کے لیے انسان کو کسی مشکل میں نہیں ڈالا۔ بلکہ پہلے اسے نفسیاتی طور پر اس کی خود اپنی معزز، محترم، اشرف اور ساری کائنات میں برتر حیثیت کی طرف توجہ دلائی تاکہ اس فراموش کردہ نفس الامری حقیقت کو اس لیے آسانی سے قبول کرے کہ اس کے قبول کر لینے میں انسان کی عزت ہی عزت ہے۔

وہ یہ کہ اسلام انسان کو پیدائشی گنہ گار قرار نہیں دیتا۔ اور نہ گناہ کو وراثت میں ملنے والی شئے تسلیم کرتا ہے بلکہ اس کے احسن تقویم پر پیدا ہونے کی بشارت دیتا ہے اور ہر عمل کا ذمہ دار خود اسے قرار دیتا ہے۔

پہلا انسان آدم ہے اور وہ نبی تھا جس میں تمام خوبیوں کا بدرجۂ اتم موجود ہونا لازم ہوتا ہے۔ اس لیے انسان عقل و شعور اور ایمان کی روشنی میں پیدا ہوا ہے۔ کفر اور گمراہی یا گناہ کے اندھیروں میں نہیں۔

۲۔ دوسرے درجہ پر قرآن حکیم اطلاع دیتا ہے کہ خدا کے حکموں کی نافرمانی اور گناہ دنیا نے خوش حال لوگوں نے نفس پرستیوں اور عیش کوشیوں اور باہمی حسد و عداوت کے جذبات سے مغلوب ہو کر کرنے شروع کیے اور اپنی اپنی پاداش عمل میں تباہ و برباد ہوتے رہے۔ فرمایا:

> "اور جب ہم کو کسی گاؤں کا ہلاک کرنا منظور ہوتا ہے ہم اس کے خوش حال لوگوں کو (کوئی سا بھی) حکم دیتے ہیں پھر وہ اس بستی میں نافرمانیاں کر چلتے ہیں۔ پھر وہ بستی حکم عذاب کی مستحق ہو جاتی ہے۔ پھر ہم اس بستی کو مار مار کر تباہ کر دیتے ہیں۔" (بنی اسرائیل ۔ ع ۲)

۳۔ اب تیسرے درجہ پر اس کھلی حقیقت اور ان کے اپنے اختیار کردہ اصول پر توجہ دلائی کہ اگر تمہیں آباؤ اجداد کی تقلید پر ہی اصرار ہے تو اے مکہ کے اسمٰعیلی نسل کے قریشی مشرکو! اور اے سارے عرب اور دیگر ممالک میں پھیلے ہوئے اہل کتاب کہلانے

والے اسرائیلی نسل پرستو! کیا ابراہیمؑ تم دونوں کا باپ اور جدِ امجد نہیں؟ اس نے اپنے باپ آزر کو مخاطب ہو کر اُسے اور اس کی ساری قوم کو گمراہ کہہ کر اُن کی تقلید اور پیروی سے انکار نہیں کیا؟ معاشی اور معاشرتی رسوم کے علاوہ ان کی ستارہ پرستی کے مذہبی عقیدہ سے انکار نہیں کیا؟ ستارے، چاند حتیٰ کہ سارے نظامِ شمسی کی مرکزی قوت سورج دیوتا کی پوجا اور اس کی خدائی ماننے سے انکار نہیں کیا؟ حکومتِ وقت کے قانون باپ کی بنی بنائی پیشوائی کی سب سے اونچی گدی کا وارث بننے سے انکار نہیں کیا؟ غرض وہ بڑے آباؤ اجداد کی تقلید سے انکار کر کے ہی اس مقام پر نہیں پہنچا کر ساری دُنیا کی امامت کا رتبہ پایا اور تم بھی اسے انہیں قربانیوں کی بنا پر ہی اپنا پیشوا مانتے ہو۔ لیکن عمل کرتے ہو درمیان میں پیدا ہونے والے ان گمراہ باپ دادوں کے طریقے پر جنہوں نے اُس مُوحّدِ اعظم بُت شکن کی تعمیر کی ہوئی مسجد (بیت اللہ) میں ایک دو نہیں تین سو ساٹھ بت کہیں سے لا کر رکھ دیئے اور ستم بالائے ستم یہ کہ خود ابراہیمؑ بت شکن اور اسمٰعیلؑ کا بُت بھی بنا کر اس مسجد میں نصب کر دیا۔ (بنی اسرائیل: ۱۶)

سورۂ انعام رکوع ۱۰ میں تمام مشہور انبیاء کے نام گِنا کر اور ان کی نیک اولاد کا حوالہ دے کر حکم دیا کہ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (انہیں کے راستہ پر تم چلو)

فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَارِ!

دعوتِ اسلام نے ایک نئی دنیا پیدا کی

۱۔ اس نئی دنیا میں حکومت صرف خدائے برتر کی ہے۔ بنی نوعِ انسان کا ہر وہ فرد جو اس دنیا میں آباد ہے وہ صرف خدائے احکم الحاکمین کا محکوم اور پروردگارِ العالمین کی رعایا ہے اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللّٰهِ۔ اس دنیا میں خدا کے بغیر کسی دوسری شخصیت اور کسی دوسری قوت کی حاکمیت کا سایہ تک نہیں۔ جیسے اس دنیا کی کائنات میں کسی قسم کے

کسی تصرف کا کوئی حق و اختیار ہو۔ یہاں صرف اور صرف اسی ایک وحدہٗ لاشریک کی حکومت ہے۔ وہ سب عیبوں سے پاک ہے، کسی کا محتاج نہیں۔ عالم الغیب ہے سب کے حالات سے واقف ہے، سب کا نگہبان ہے۔

۲۔ اس وحدہٗ لاشریک کی نیابت میں اس کے تشریعی قانون کو بنی نوع انسان میں نافذ کرنے کی ذمہ داری اس کے رسولِ برحق حضرت محمد مصطفیٰؐ اور احمد مجتبےٰ خاتم النبیینؐ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے جن پر نبیوں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے اور خدا کی ہدایت کا وہ سلسلہ جو آدمؑ سے شروع ہوا اور ہر پیغمبر اللہ کے بندوں تک اس کے حکم سے حسب ضرورت پہنچاتا رہا۔ آنحضرتؐ کے ذریعہ تکمیل تک پہنچ گیا۔ اس لیے آپ کی رسالت پر ایمان لانا اس حکومت کی محکومی تسلیم کرنے، اس پروردگار کی ربوبیت میں شامل ہونے اور اس دنیا میں رہنے اور اس کے باشندہ بننے کے لیے شرطِ اول ہے۔ یہ دنیا انہیں لوگوں سے آباد ہے۔

اس دنیا میں انسان کی دو حیثیتیں ہیں :۔

۱۔ ایک جسم کے لحاظ سے نسلی اور مادی حیثیت ——— اور اس لحاظ سے یہ سب کے سب آدمؑ کی اولاد ہیں اور اسی نفس واحدہ سے پیدا ہوئے اور پھلے پھولے ہیں سورۂ نساء کی پہلی آیت :

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ

اے لوگو! اپنے اس پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جنس سے اس کی بیوی کو پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں پیدا کیں۔

ان کی پیدائش کا ایک ہی طریقہ، ایک ہی دستور ایک ہی قانون ہے جسے تکوینی

کہا جاتا ہے۔ انہیں قرآن نے "یا بنی آدم" کہہ کر ہی خطاب کیا ہے اور وہ عہدِ "اَلَستُ" یاد کرایا ہے جو پہلے دن ہی ان سے لیا گیا تھا۔ اس حیثیت کا نفع نقصان معاملات اور تقاضے زیادہ تر اسی مادی زندگی سے وابستہ ہیں۔

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝

اے آدم کے بیٹو! کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا کہ شیطان کی اطاعت نہ کرنا یقیناً وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اور یہ کہ میری بندگی کرو یہی سیدھی راہ ہے۔

۲۔ انسان کی اس دنیا میں دوسری اعتقادی یا روحانی حیثیت ہے۔ جس حیثیت کے تحت اس دنیا کے رہنے والوں نے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر سارے پہلے نبیوں کی تصدیق کر دی۔ اور ایک عالمگیر نظریاتی اخوت کی بنیاد رکھ دی جس میں کسی نسلی تفریق و انتشار کی بھی کوئی گنجائش نہ رہ گئی۔ یہ وہ ترقی یافتہ صورت تھی جو نوعِ انسان کی تخلیق کا اصل مقصد اور منشا تھا۔

لیکن افسوس! انسان ہمیشہ اس عالمگیر برادری کے رشتۂ اخوت کے مادی تعلق سے بھی گریز کرتا رہا اور نظریات کی اس وسیع روحانی دنیا کے آفاقی حدود سے باہر نکل جانے کی بھی ناکام کوششوں میں ہمیشہ مصروف رہا ہے۔

مادی دُنیا

دُوسرے ہم نوع سے آگے بڑھنے، بڑا بننے اور کسی نہ کسی حیثیت سے امتیازی شان حاصل کرنے کی خواہش ہر وقت اور ہر دَور میں انسان کو اس بے اعتدالی پر اُکساتی رہی ہے جسے قرآن کریم نے "بَغْيًا ۢ بَيْنَهُمْ" کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ "کَانَ

النَّاس تا آخر پوری آیت ایک بار پھر سامنے رکھ لو۔

مادی، روحانی یا جسمانی اور نظریاتی دونوں حیثیتوں سے انسان کی یہ کوششیں غیر فطری، غیر اخلاقی بلکہ غیر اسلامی تھیں۔

جسمانی حیثیت سے یہ آدم کا فرزند ہے۔ اگر نسلی یا جسمانی حیثیت پر فخر ہی مطلوب تھا تو سب سے پہلے نبی ابوالبشر خلیفۃ اللہ سارے نبیوں کے باپ کا فرزند کہلانے سے بڑھ کر نسلی تفاخر کا اور کونسا ذریعہ ہو سکتا تھا۔ لیکن اپنے دوسرے بنی نوع میں امتیازی حیثیت حاصل کرنے کے شوق میں اس نفس الامری حقیقت کو فراموش کر گیا کہ آدم جیسے صفی اللہ برگزیدہ پیغمبر کے بجائے اپنے کسی مشہور مُورث کی اولاد ہونے پر فخر کرے۔ یاد رہے کہ ہزارہا موجودہ ذاتیں اور گوتیں صرف ان اشخاص کے ناموں پر مشہور ہیں جو کسی برادری میں کسی حیثیت سے نامور ہوئے ہیں۔ خواہ آج اس وقت ان کی اولاد ہونے پر فخر کرنے والوں کو ان کے حالات کا ذرہ برابر علم بھی نہیں۔ یہ تک معلوم نہیں کہ ان کی اخلاقی اور دینی حیثیت کیا تھی۔ تاہم یہ لوگ آدم علیہ السلام کی واضح قابلِ فخر مسلمہ شخصیت کے مقابلے میں ان مجہول الحال ناموں پر فخر کرنا زیادہ مناسب بلکہ ضروری خیال کرتے ہیں۔ آخر بھنڈر، ڈھاڑی، بُبڑ، میو، رہنگڑ، سگھر، گھمن، سانسی وغیرہ کون لوگ ہوتے ہیں؟ اور ان میں آدم سے بڑھ کر کونسی خوبیاں ہیں؟

یہ محض اس لیے کہ دوسروں سے آگے بڑھنے، بڑا بننے اور امتیاز حاصل کرنے کا یہی ایک ذریعہ نظر آیا۔ حالانکہ یہ فخر کا مقام نہیں ذلت کا نشان ہے۔ بڑا بننا نہیں تنزّل ہے، امتیاز نہیں افتراق و انتشار ہے۔ بڑا بن کر چھوٹا ہونے کا کھلا اعتراف ہے۔

دینِ فطرت، اسلام نے دوسروں سے آگے بڑھنے کی کھلی چھٹی ہی نہیں دی بلکہ حکم دیا ہے کہ ایک دوسرے سے آگے بڑھو اور اس انسانی فطری جذبہ کی دل کھول کر آبیاری اور سیرابی کرو۔ لیکن کس میدان میں؟ جس میدان میں آگے بڑھ سکتے

ہو۔ نسل کے میدان میں حضرت آدمؑ کی نسبت کو نظر انداز کر کے کسی اور کے نام پر فخر کرو گے تو یہ باعزت شخصیت کو چھوڑ کر کم اور بہت کم درجہ کی کسی شخصیت پر فخر ہو گا خواہ یہ نوعِ انسانی کی کوئی بڑی سے بڑی شخصیت ہی کیوں نہ ہو۔ مال و دولت کی زیادتی یا قہر و سطوت اور حکومت و تغلّب پر ریجھو گے تو اس میں دوسروں کے حقوق کی پامالی کا ظلم لازماً شامل ہو گا۔ قرآن مجید نے حکم دیا ہے:

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ - نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔

اس مسابقت کا نتیجہ ہمیشہ مثبت صورت ہی میں سامنے آئے گا۔ ایسے معاشرے میں نیکی ہی نیکی کو رواج حاصل ہو گا۔ ہر آدمی دوسرے کا بھلا چاہے گا۔ اور سب کا بھلا ہو گا۔ نیکی آگے بڑھے گی اور برائی مٹتی چلی جائے گی۔

نظریات کی اعتقادی دُنیا

اب رہی نظریات کی اعتقادی دنیا کا باشندہ ہونے کی صورت میں انسان کی اخلاقی اور روحانی حیثیت۔ جس دنیا میں وہ کسی دینی، اخلاقی اور عقلی نظریہ پر یقین کر کے آباد ہوا ہے۔ یہاں اس کی صرف دو حالتیں ہیں۔ نیک اور بد، بَرٌّ تَقِیٌّ اور فَاجِرٌ شَقِیٌّ۔ نیک، خدا کو ماننے والا صاحبِ تقویٰ یا خدا کا نافرمان بدبخت۔

فاجر کسی اصول کسی دستور اور کسی قانون کا پابند نہیں۔ وہ بے اصول بن کر لامتناہی گمراہیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ زمین و آسمان کے مالک و خالق وحدہٗ لاشریک کی حقیقی حاکمیت کے لازوال تعلق سے بے نصیب ہو کر اپنی ہستی کو بے نام و نشان کر دیتا ہے قرآن حکیم نے اس کی حیثیت ذیل کے الفاظ میں بیان فرمائی ہے:-

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ — اور جس شخص نے خدا کے ساتھ

مِنَ السَّمَآءِ فَتَخۡطَفُهُ الطَّيۡرُ اَوۡ تَهۡوِیۡ بِهِ الرِّیۡحُ فِیۡ مَكَانٍ سَحِیۡقٍ ۝ کسی دوسرے کو شریک ٹھہرایا وہ گویا آسمان سے گر پڑا سو اسے کوئی گوشت خور جانور اُچک لے گا یا ہوا اسے کسی دُور دراز گمنام جگہ میں پھینک کر بے نام و نشان کر دے گی۔

ان ہر دو یعنی نیک اور بد میں سے قابلِ ذکر وہ نیک ہے جس نے اُس دنیا میں آنکھیں کھولیں جہاں اس نے خدائے واحد کی حاکمیت کو دل و جان سے قبول کر لیا۔ اس دنیا کی بنیاد فسق و فجور، نافرمانیوں اور من مانیوں کی آوارگیوں پر نہیں بلکہ خدا اور خدا کے سچے رسول کے احکام کی پابندیوں پر ہے۔ بے قید نہیں، نظریات پر مبنی ہے مادی دنیا میں حیوان اور انسان کی زندگی میں کوئی فرق و امتیاز نہیں حیوان بھی اپنی خواہش کے مطابق نفسانی تقاضے پورے کرتا ہے اور انسان بھی کسی اخلاقی دستور کا پابند نہیں لیکن یہاں اخلاقی اور نظریاتی دنیا میں ازدواجی تعلق میں پہلی شرط مُحرّمات کی پابندی ہے کھانے پینے میں ظاہری ستھرائی اور صفائی ہی کافی نہیں اس ترقی یافتہ مقام پر حلال اور حرام کا امتیاز زیادہ ضروری ہے۔ کپڑا پہننے میں مرد اور عورتوں میں علیحدہ علیحدہ احکام اور پہننے کے انداز پر پابندیاں، سونے جاگنے کے اوقات پر ہدایات۔ چلنے پھرنے میں احتیاط کی تاکید وَلَا تَمۡشِ فِی الۡاَرۡضِ مَرَحًا اِنَّكَ لَنۡ تَخۡرِقَ الۡاَرۡضَ وَلَنۡ تَبۡلُغَ الۡجِبَالَ طُوۡلًا (زمین میں اکڑ کر نہ چل تو زمین کو پھاڑ نہیں دے گا اور نہ پہاڑ کی بلندی کو پہنچ جائیگا۔) معاملات میں قدم قدم پر مفصل قواعد و ضوابط کی تلقین۔ دوسروں کے حقوق میں دست اندازی سے بچ کر صرف مُثبت طریقوں پر زندگی کا ایک ایک لمحہ گزارنے کی پابندیاں موجود ہیں یہاں تک کہ آنکھ کے اشارے اور پھر دل کے ارادے پر بھی محاسبے اور جواب دہی کی وعید۔ یعلم خائنۃ الاعین . . . . ان السمع والفواد کل اولٰئک کان عنہ مسئولا ۝

غرض اس دنیا کے روز و شب صبح و شام، مشاغل اور مصروفیتیں، نقل و حرکت

اور نقل و حرکت کے ارادوں تک ہر شے ایک ضابطے کے تحت ہے جس ضابطے کا تجویز کرنے والا صرف ایک اَحْکَمُ الحاکمین ہے۔ وہی زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی ان قوانین کو منضبط کرنے والا ہے۔

ایک شُبہ کا ازالہ

یہ خیال نہ گزرے کہ اس قدر عام پابندیاں انسانی زندگی کی آزادی کے منافی ہیں اور اس کی زندگی کو مصیبت میں مبتلا کرنے والی ہیں۔ بلند قسمت انسان نے انہیں اپنی مرضی اور پسند سے خود اختیار کیا ہے۔ اپنی آئندہ زندگی کی بہتری اور بھلائی کے پیش نظر اس فطری پروگرام اور قدرتی نظام کو اپنی اس مادی دنیا اور حیاتِ اُخروی کے لیے امن و اطمینان کی ضمانت یقین کیا ہے اور صحیح یقین کیا ہے۔ یہ فیصلہ اس کی پُر اعتماد شخصیت کی روشن دلیل ہے۔

بہر حال انسان نے بلند نگاہی سے کام لے کر اگر نظریات کی اس با اصول دنیا میں زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو وہ بے اصولیوں کے ان تمام بُرے نتائج سے محفوظ ہو گیا جو کسی حیوانی زندگی کا مُقدّر ہوتے ہیں۔ یہ انسان کا وہ اصل مقام اور اس کی تخلیق کی غرض و غایت ہے اور اس کی عملی زندگی کی ترقی یافتہ صورت۔ خدا کے تشریعی قانون کو دنیا میں نافذ کرنے کی مُقدّس اور بلند تر ذمّہ داری جسے خلافتِ الٰہیہ کہتے ہیں یہی مقام ہے۔ مولانا جامی نے اسی انسان کو مخاطب ہو کر کہا ہے۔ کہتے ہیں :-

تو ئی آں دست پرور مُرغ گستاخ
کہ بودت آشیاں بیروں ازیں کاخ
چرا زاں آشیاں بیگانہ گشتی
چو دوناں چغد ایں ویرانہ گشتی

"تو وہی دستِ قدرت کا پروردہ ہوشیار پرندہ ہے جس کا آشیانہ اس گنبدِ افلاک سے اوپر تھا تو اُس آشیاں سے کیوں دُور ہوگیا ہے اور اِس مادّی دنیا کے ویرانے کا اُلّو بن کر رہ گیا ہے"

اس نظریاتی دنیا میں آکر انسان صرف خدا کے حکم کا پابند ہوتا ہے باقی کسی شے کا کوئی وزن اس کی نگاہ میں نہیں رہ جاتا۔ اجسام ارضی ہوں یا اجرام سماوی، خدا کی نیابت میں ہر شے اس کی فرماں بردار ہوتی ہے۔

سحر و حجر کی پرستش کرنے والی، سورج اور چاند کو دیوتا اور حاجت روا ماننے والی، دن رات کے ذریعہ تبدیل ہونے والے ایک ایک دن کو تہوار بلکہ رات اور دن کے ذریعہ تبدیل ہونے والے ایک ایک دن کو تہوار بلکہ رات اور دن کے ایک ایک گھڑی اور پل سے نیک و بدشگون لینے والی، سعد و نحس کی پجاری اور شُبھ اور اُشبھ ساعتوں کی غلام دنیا کو جو آسمان کے ایک ایک ستارے، زمین کے ایک ایک ذرّے اور گھاس کے تنکوں تک سے خوف زدہ تھی، ایمان سے ناآشنا اور کفر میں غرق اس مادی دنیا کو قرآن حکیم کی حرّیت آموز انقلابی دعوت نے واضح اور کھلا کھلا پیغام دیا کہ:۔

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝

اور جہاں اور بہت سی نشانیاں ہیں خدا کی قدرت کی نشانیوں میں سے رات اور دن اور سورج اور چاند بھی ہیں۔ تو لوگو! نہ تو سورج کو سجدہ کرنا اور نہ چاند کو۔ اور اگر تم کو خدا کی عبادت کرنی ہے تو اللہ ہی کو سجدہ کرنا جس نے ان چیزوں کو پیدا کیا ہے۔

سُورج اور چاند کے سامنے سربسجود ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ اس خالق کائنات کے بلند آستانے پر جھکنا عقلمندی اور آزادی ہے جس نے اس ساری کائنات کو پیدا

کرکے انسان کا خدمت گار بنایا۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَآتَاكُمْ مِنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ۔

اور کشتیوں کو تمہارے اختیار میں کر دیا۔ تاکہ اس کے حکم سے دریا میں چلیں اور نیز ندیوں کو تمہارے اختیار میں کر دیا۔ اور (اسی طرح) سورج اور چاند تمہارے اختیار میں کر دیا۔ کہ دونوں پڑے چکر کھا رہے ہیں اور ایسا ہی رات اور دن کو تمہارے اختیار میں کر دیا اور اور جو کچھ تمہارے درکار تھا بقدرِ مناسب تم کو دیا۔

قرآن حکیم نے بار بار یقین دلایا ہے کہ اجرام سماوی ہوں یا اجسام ارضی، کائنات کا ذرہ ذرہ تیرا خادم اور فرماں بردار ہے۔ رات تیری راحت اور سکون کے لیے ہے۔ اس میں تو چوری، راہزنی اور زنا جیسے جرائم کا ارتکاب بھی کر سکتا ہے اور سکون و خاموشی کی فضا سے فائدہ اٹھا کر نماز کا حضور اور تہجد کا سرور بھی حاصل کر سکتا ہے۔ دن کی سہولت سے طلب معاش کے سلسلہ میں حلال و حرام کا انتخاب بھی تیرے بس میں ہے۔

جس صورت میں رات دن تیرے خادم ہیں تو راتوں اور دنوں کی بنا پر وجود میں آنے والے تہوار تیرے لیے سعد اور نحس کس طرح ہو سکتے ہیں؟

الغرض عقائد اور نظریات کی اصل دنیا میں آ کر یہاں خدائے واحد کی حاکمیت کے بغیر کوئی فرماں روائی نہیں۔ انسان ان خونی رشتوں کو بھی فراموش کر دیتا ہے۔ جو ایک نفس واحد آدم ؑ کی نسل ہونے کی حیثیت سے اس کو ایک دوسرے سے وابستہ کیے ہوئے تھے، یہاں حضرت نوح ؑ کی طرح نظریے اور عقیدے کے مقابلے میں باپ اور بیٹے کے درمیان کا رشتہ بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ اور ابراہیم علیہ السلام کی طرح بیٹے اور باپ کا بھی باہم کوئی تعلق باقی نہیں رہ جاتا۔ اب غور فرمائیں کہ یہاں دنوں اور راتوں، سالوں اور مہینوں، وقتوں اور

موسموں، تاریخوں اور تہواروں کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔ یہاں صرف حکم خداوندی کا وزن اور اعتبار ہے اور بس۔ یہی ہے انسانی شرف و مجد کا اصلی مقام۔

ایک نفسیاتی تجزیہ اس میں شک نہیں کہ انسان سب کچھ قربان کر سکتا ہے لیکن اپنے نفس کے تقاضے کو قربان نہیں کر سکتا۔ کسی کو حاکم اور آقا مانتا ہے تو دل کے کہنے پر اور کسی کو استاد و مُرشد بناتا ہے تو بھی من کی مرضی سے ورنہ

من کی دنیا میں نہ دیکھا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن

حضرت آدمؑ نفس کے تقاضے کے مقابلے میں حکم خداوندی کو بھول گئے اس میں گو ابلیس کا دخل تھا لیکن یہ دخل بھی جب ہی کارگر ہوا کہ حضرت آدمؑ کے نفس نے اس دخل کو قبول کر لیا۔ کسی شاعر نے ان واردات کو ابلیس کی زبان سے ادا کیا ہے:

ابلیس چو در آدم و حوّا نگریست
بنشست و بہ ہائے ہوئے برخود بگریست
وانگہ بزبانِ حال با آدم گفت
ابلیس تو من، بگو کہ ابلیسم کیست؟

(ابلیس نے جب آدم و حوّا کو پریشان حال دیکھا اور اس ساری خرابی کا موجب شیطانی اغوا ہی سنائی دیا تو علیحدہ بیٹھ کر اپنے حال پر زار زار رویا۔ اور پھر زبانِ حال سے آدم کو مخاطب ہو کر کہا کہ "تیرا ابلیس تو میں ہی سہی لیکن یہ تو بتاؤ کہ میرا ابلیس کون ہے؟)

غرض ابلیس کا اغوا بھی اسی وقت اثر انداز اور کامیاب ہوتا ہے جب نفس اس کے اغوا کو پسند کر لیتا ہے ورنہ اللہ کے مخلص بندوں پر جو اپنی رضا خدا کے سپرد کر چکے ہوتے ہیں اس کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ حضرت آدمؑ بھول گئے اس بھول میں ابلیس کا اغوا کامیاب ہو گیا۔ پھر سنبھلے بارگاہِ خداوندی کی طرف انابت و رجوع کیا نفس کے تقاضوں

کو حکم خداوندی کے سپرد کر دیا تو بہ قبول ہو گئی اور درجۂ اجتبٰی حاصل ہو گیا۔ ابلیس اپنے نفس کے تقاضے کی حفاظت پر جما رہا۔ ہمیشہ کے لیے ملعون قرار دیا۔ ورنہ قصور دونوں طرف سے ایک ہی تھا ایک کو روکا گیا، نہ رکا۔ دوسرے کو کرنے کا حکم دیا گیا اس نے نہ کیا۔ علامہ اقبال مرحوم نے شاعرانہ انداز میں دونوں تقصیر داروں کی طرف سے معذرت کی ہے۔ ؎

جرمِ او از سجدہ، تقصیرِ ما از دانہ
نے باو بے چارہ مے سازی نہ باما ساختی!

حرفِ آخر

ان تمام مباحث سے حسب ذیل چند نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ اصل غرض اس ایمان اور یقین کو پختہ کرنا ہے کہ انسانیت کی اصل معراج خلافتِ الٰہیہ ہے اور اس اصل دنیا کو آباد کرنا اس کا مقصدِ حیات ہے۔ جس دنیا میں محض اور محض خدا کی حکومت ہو ـــــ بندہ صحیح معنوں میں خدا کا بندہ ہو اور باقی سب مخلوق انسان کی خادم و خدمت گزار۔ انسان کا ایمان و عمل ہی اصل قوتِ مؤثرہ ہے۔ باقی ہر شے کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔

۲۔ سطور بالا کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ اخلاقی اور روحانی دنیا جس میں صرف خدا ہی کی حکومت کارفرما ہے، انسان خود بناتا ہے اپنے ضمیر کے فیصلے کی بنا پر بناتا ہے۔ جس فیصلے پر کسی بیرونی دباؤ کا کوئی اثر نہیں۔

۳۔ چونکہ یہ اس کا اپنا طے کیا ہوا فیصلہ ہوتا ہے، لہٰذا اسے اس کی پاسداری ہر شے سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ تمام خواہشات کو پہلے ہی نظر انداز کر کے یہ فیصلہ کرتا ہے۔ اس لیے اس فیصلے کے بعد کوئی ایسی تمنا اور نفس کی کوئی بڑی سے بڑی خواہش بھی اُسے اس فیصلہ سے انکار یا استنکار نہیں کرا سکتی۔

۴۔ایک بے وسیلہ سے بے وسیلہ مجبور و محکوم انسان بھی اپنے آزاد ضمیر یا ضمیر کی آزادی کی بنا پر یہ فیصلہ کر سکتا ہے اور فیصلہ کر کے اپنی ایک نئی دنیا آباد کر لیتا ہے۔ اس اعتقادی اور روحانی دنیا کی آبادی کے لیے مادی دنیا کی طرح سنگ و خشت اور کسی علیحدہ خطۂ ارضی کی احتیاج نہیں۔ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی لامحدود وسعتیں اور حکومتِ الٰہیہ کی پہنائیاں اس کی تعمیر کے لیے موجود ہیں۔

تیرا جہاں ہے وہی جس کو تو کرلے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تیری نگاہ میں ہے

۵۔ یہ تعجب کی بات نہیں کہ اسی مادی دنیا میں یہ اعتقادی دنیا کس طرح آباد ہو سکتی ہے اور آباد رہ سکتی ہے؟ جس دن یہ دنیا آباد ہوئی اس دن سے لے کر آج تک اوپر سے لے کر نیچے تک ہر سطح اور ہر طبقہ میں ہر وقت یہ مناظر اور یہ مظاہر موجود نظر آتے ہیں۔ حبشی غلام بلال رضؓ اور اس کے مالک اُمیّہ بن خلف کیا دونوں کی دنیا ایک تھی؟ ایک ظلم کر رہا ہے اور کر سکتا ہے، دوسرا ظلم سہہ سکتا ہے اور سہہ رہا ہے۔ مظلوم ظلم سہہ کر خوش ہے اور اپنی کامیاب زندگی پہ نازاں اور ظالم ظلم کر کے بھی پریشان ہے اور اپنی ناکامی پر غم و غصہ کی آگ میں جل رہا ہے۔ زنیرہ حضرت عمر رضؓ کے گھرانے کی ایک بے بس کنیز۔ ابوجہل اسے غصے میں اندھا ہو کر اتنا مارتا ہے کہ اس بے چاری کی آنکھیں جاتی رہیں۔ لیکن اس کے لیے یہ دنیا روشن ہو گئی اور ہمیشہ روشن رہی۔ کیا ان دونوں کی دنیا ایک تھی اور پھر ان دونوں کے درمیان کتنا فاصلہ تھا؟

اُبوفکیہہ رضؓ غلام اور اس کے مالک صفوان بن اُمیہ، دونوں ایک دنیا میں آباد تھے؟

حضرت لبینہ رضؓ ایک بے بس کنیز جسے اپنے مسلمان ہونے سے پہلے حضرت عمرؓ جیسا قریشی جوان قبولِ اسلام کے جرم میں مار مار کر تھک جاتے تو کہتے کہ کسی رحم کی بنا پر تجھے نہیں چھوڑ رہا ذرا دم لے کر پھر ماروں گا۔ کیا یہ مظلومہ اسی دنیا میں مطمئن نہ تھی جس دنیا

میں خود عمار رضؓ بھی آئے ؟

حضرت سمیّہ رضؓ، حضرت عمّار بن یاسر رضؓ کی والدہ جنہیں ابو جہل نے برچھی مار کر دنیا بدلنے کے جرم کی پاداش ہی میں شہید کیا دنیا بدلنے والی اور اس جرم کا انتقام لینے والا کیا دونوں ایک ہی دنیا میں آباد تھے ؟ (اسلام کی راہ میں یہ پہلی شہادت ہے جو ایک عورت نے پیش کی۔)

غرض ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک انسانی کائنات کی تاریخ کا سرسری جائزہ بھی لو تو یہ دونوں دنیائیں دوش بدوش چلتی نظر آئیں گی۔

۶۔ رہا یہ سوال کہ اتنی زبردست تبدیلی جس سے زمین و آسمان بدل جاتا ہے، ایک طرف ہر شے اور کائنات کے ذرّے ذرّے کی خدائی مانی جارہی ہے حتّٰی کہ بدنصیب انسان اپنے نفس کا بھی غلام ہے بلکہ خدائی دعویٰ کرنے والا انسان بھی عملاً ہر ذرّے کا محتاج اور غلام ہے اور دوسری جانب غلام بھی کسی کے غلام نہیں۔ آقا بھی اپنی آفاقی متوازی کیلئے ان کے سامنے بے بس ہیں — آخر ایسا انتہائی حیرت انگیز انقلاب برپا کرنا یا برپا ہونا آسان کام تو نہیں۔ ہر کوئی اس پر کس طرح قادر ہو سکتا ہے ؟

واقعی یہ سوال سنجیدہ غور کا مستحق ہے۔

اس سوال کے حل میں پہلی سہولت تو یہ ہے کہ اس کا حل ہر ایک شخص کے اپنے بس میں ہے۔ اس سلسلہ میں کسی دوسرے کی مدد کا محتاج نہیں اور پھر اس طرح کوئی دوسرا اس کے فیصلے میں مزاحم بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ دل کا معاملہ ہے اور دل کسی دوسرے کے قبضے میں آنے والی قوت نہیں۔ مادی دنیا کی مجبوریوں میں سب سے زیادہ پیٹ کی مجبوری ہے لیکن یہاں دل کا قبضہ ایک دم میں محتاجوں کو بے نیاز اور شاہوں کو گداگر بنا کر رکھ دیتا ہے۔ کہنے والے نے کیا درست کہا ہے :-

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم
دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

یہ بھی ایک سوال ہے کہ اس انقلاب پر کتنا وقت صرف ہوتا ہے؟ ابوبکر صدیق رض سے پوچھو اُس دنیا سے اِس دنیا میں آنے پر کتنا وقت صرف ہوا؟ کتنا سفر طے کرنا پڑا؟ ادھر دعوتِ حق سامنے آئی، ادھر دل نے قبول کی۔ عمر فاروق رض کی حالت پر غور کرو ننگی تلوار لے کر گھر سے نکلتا ہے کہ دنیائے اسلام کی شہ رگِ حیات ہی کاٹ دے۔ لیکن دل نے دوسری طرف فیصلہ کر دیا۔ کتنا وقت لگا؟ ایک سانس کفر کی آخری حد پر ہے اور دوسرا سانس ایمان کی آخری حد پر۔

اور پھر یہ تبدیلی وہ تبدیلی ہے جس کا ذکر بار بار آ چکا ہے کہ غلام صرف اپنے اُن آقاؤں ہی سے آزاد نہیں ہو گئے۔ بلکہ ان منکرِ حق آقاؤں نے جن قوتوں کو اپنا آقا ہی نہیں خدا سمجھا ہوا تھا، ان سب کی غلامی اور بندگی سے بدرجۂ اولیٰ آزاد ہو گئے۔ بلکہ یہ تمام قوتیں جن میں بحر و بر سے لے کر سورج اور چاند جیسے اجرامِ سماوی بھی شامل تھے۔ اب مسلمانوں کے سامنے آقاؤں کے آقا کے بجائے غلاموں کے غلام تھے۔ سورج اور چاند اگر بحکمِ قرآن مسلمانوں کے خدمت گزار اور فرماں بردار ہیں۔ تو ان کی بنا پر پیدا ہونے والے دن تاریخیں اور اوقات کی کیا اوقات رہ جاتی ہے کہ یہ مسلمان کے لیے نحوست و برکت تقسیم کریں۔ اس دنیا میں انسان راتوں، دنوں اور تاریخوں کا غلام نہیں بلکہ رات دن، ماہ و سال اور وقت و تاریخ سب اُس کے غلام اور فرماں بردار ہیں۔ ؎

ستارہ کیا میری تقدیر کی خبر دے گا
جو آپ گردشِ افلاک میں ہے خوار و زبوں

مادی دنیا سے لے کر انسان کی روحانی دنیا تک کے سفر کا مختصر خاکہ کئی مختلف صورتوں میں محض اس لیے پیش کیا گیا ہے کہ اس سے انسان اس نئی دنیا کی قدر و قیمت کا اندازہ کر سکے۔ یقین کر سکے کہ جس دنیا کو نئی سمجھتا ہے یہی اس کی اصل دنیا ہے۔ اسی دنیا میں اس کے باپ آدم کو بسایا گیا تھا۔ غلطی کر کے جہاں سے وقتی طور پر نکلنا پڑا، اب اسے حقِ وراثت کی حیثیت سے حاصل کرنا اس کا اصل نصب العین ہے۔ اس کے حاصل کرنے میں کس قدر منافع، سہولتیں، آسانیاں اور کامیابیاں مضمر ہیں اور خود اس کا حاصل کرنا کس قدر آسان ہے اور بدرجۂ آخر اس دنیا میں صرف ایک کی غلامی اختیار کر کے ساری کائنات کی آقائی کا مقام کس سہولت سے حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس حقیقت پر ایمان لے آنے میں مضمر ہے کہ :

لکم ما فی الارض جمیعاً . . . .

. . . نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

جمعہ

مسلمانوں کی دینی تقریبات میں فضائل کے لحاظ سے جمعہ کو اوّلیت کا درجہ حاصل ہے۔ اس لیے اس کا ذکر بھی پہلے نمبر پر مناسب نظر آتا ہے۔ جمعہ کے فضائل میں کتبِ احادیث میں مستقل باب ہیں جن میں جمعہ کے فضائل، آداب اور خصائص بڑی تفصیل سے درج ہیں اور بروایاتِ معتبرہ درج ہیں ——— سب سے پہلے یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ قرآن مجید نے نمازِ جمعہ کو فرض قرار دیا ہے۔

یاایھا الذین امنوا اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ وذروا البیع ط ذلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون ۔ ترجمہ "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جس وقت کہ پکارا جاوے واسطے نماز کے دن جمعہ کے۔ پس شتابی کرو طرف یادِ خدا کی اور چھوڑ دو سودا کرنا یہ بہتر ہے واسطے تمہارے اگر ہو تم جانتے۔"

صحیح بخاری میں ابی ہریرہ رضؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

عن ابی ھریرۃ انہ سمع رسول اللہ یقول	حضرت ابی ہریرہ رضؓ سے روایت
نحن الاخرون السابقون یوم القیامۃ بید	ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ
انھم اوتوا الکتاب من قبلنا ثم ھذا یومہ	وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہم

الذی فرض علیہم فاختلفوا فیہ فھدانا اللہ لہ فالناس لنا فیہ تبع الیھود غداً والنصاریٰ بعد غد۔

گو بعد میں آنے والے ہیں لیکن قیامت کے دن آگے بڑھ جانے والے ہیں سوائے اس کے کہ وہ ہم سے پہلے کتاب دیئے گئے

پھر یہ جمعہ ان کا دن تھا جو ان پر فرض کیا گیا تھا۔ پس انہوں نے اس میں اختلاف کیا۔ سو اللہ تعالیٰ اس دن کی طرف ہماری رہنمائی کردی۔ اب یہ لوگ اس معاملے میں ہمارے پیچھے ہیں۔ یہود کل پر اور نصاریٰ پرسوں پر۔ (بخاری، کتاب الجمعہ) یہود کو جمعہ ہی کا دن دیا گیا تھا لیکن قوم نے موسےٰ ؑ سے اختلاف کیا۔

اور پھر اس لحاظ سے بھی تقریبات کے ذکر میں جمعہ کو اولیت کا مقام حاصل ہے کہ متعدد احادیث میں حضرت آدم ؑ کا پیدا ہونا، فوت ہونا، جنت میں داخل ہونا، جنت سے نکالا جانا، زمین پر اترنا اور آپ کی توبہ قبول ہونا حتّٰی کہ قیامت کا برپا ہونا۔ یہ سب اہم واقعات حضرت آدم ؑ کی پیدائش سے لے کر قیامِ قیامت تک سب کا اسی یومِ جمعہ میں وقوع بیان فرمایا گیا ہے۔ یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ جنوں اور انسانوں کے بغیر سب حیوانات جمعہ کی صبح طلوعِ آفتاب تک صبحِ قیامت کے منتظر اور اس انتظار میں مضطرب رہتے ہیں۔

اس کے فضائل میں یہاں تک لکھا ہے کہ اس میں ایک ساعت ایسی آتی ہے کہ اس وقت ہر منتظر اور مسجد میں حاضری دینے والے مومن کی دعا قبول ہوتی ہے۔ یہ سب دنوں کا سردار ہے وغیرہ وغیرہ۔

غرض یہ تمام روایات اس دن کی فضیلت پر ایسی شہادت ہیں جن سے انکار بلکہ شک تک کی گنجائش نہیں۔ یہی روایات ہیں جن سے یہ خیال بھی پیدا ہوتا ہے اور لازماً پیدا ہوتا ہے کہ خاص دنوں کی فضیلت سے کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے۔ یہود تک

نے حاسدانہ انداز میں کہا کہ اگر

الیوم اکملت لکم دینکم و
اتممت علیکم نعمتی و
رضیت لکم الاسلام دیناً ہ

(القرآن)

ایسی کوئی آیت ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید کا دن مناتے۔ جواب میں حضرت عمرؓ نے کہا ہم جانتے ہیں یہ جمعہ کے دن نازل ہوئی اور جمعہ ہماری عید ہے۔

اس سلسلہ کی روایات کا استقصاء اس مختصر کتاب میں مشکل ہے۔ کتابیں بھری پڑی ہیں۔ عوام و خواص میں مشہور ہیں۔

رہا یہ سوال کہ کیا جمعہ کی یہ تمام خصوصیتیں اور یہ تمام فضائل ایک خاص دن ہونے کی حیثیت سے ہیں یا کچھ اور اسباب و موجبات ہیں جن کی وجہ سے یہ دن اس قدر خیر و برکات اور فضائل و خصائص کا حامل بن گیا ہے؟ چنانچہ اس سوال کے جواب میں ایک نہایت مختصر اور سادہ سے سوال پر بھی غور کر لینا کافی ہوسکتا ہے۔ وہ یہ کہ:۔

کیا وہ شخص بھی ان خیر و برکات سے مستفید ہوسکتا ہے جو کسی شرعی عذر کے بغیر جمعہ کی نماز میں شامل نہیں ہوا؟

اس کے بعد انہی روایات پر غور کرنا ضروری ہوگا جو فضائل ہی کے سلسلہ میں انہی ابواب میں باسنادِ صحیحہ وارد ہوئی ہیں۔ البتہ ذرا ذہن کو محض خوش عقیدگی اور سہل انگاری سے بچا کر اور سادہ سطح پر رکھ کر سوچنے کی ضرورت ہے بلکہ دین فطرت اسلام کے دینِ عملی ہونے کی اصل حیثیت کو پیشِ نظر رکھ لینا ضروری ہے۔

حضور اکرمؐ نے ایک جمعہ میں شامل صحابی کو فرمایا "تُو نے جمعہ کیوں نہیں پڑھا؟" اس نے عرض کیا "حضورؐ! میں تو آپ کے ساتھ تھا۔" آپ نے فرمایا میں نے دیکھا

ہے کہ تم لوگوں کی گردنوں پر پاؤں رکھ کر آگے بڑھ رہے تھے" — گویا دوسرے کئی آداب کے علاوہ صرف اس ایک ادب کو ملحوظ نہ رکھنے والے صحابی کو حضور اکرم ﷺ نے جمعہ پڑھنے کے باوجود جمعہ نہ پڑھنے والوں میں شمار کیا ہے۔

علامہ ابن قیم رح نے اپنی مشہور کتاب "زاد المعاد فی ہدی خیر العباد" میں جمعہ کی گیارہ خصوصیتیں صحیح احادیث کی روشنی میں بیان کی ہیں۔ نانویں خصوصیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

الانصات للخطبة إذا سمعها وجوبا فی أصح القولین فان ترکه کان لاغیا فمن لغی لاجمعة له وفی المسند مرفوعا والذی یقول لصاحبه انصت فلا جمعة له -	خطبہ سننے کے لیے خاموش رہنا جب اسے سن رہا ہو واجب ہے دو صحیح اقوال کی رو سے۔ پس اگر خاموشی کو ترک کر دیا تو لغویت میں پڑ گیا۔ سو جو شخص لغویت میں پڑ گیا اس کا جمعہ نہیں ہوا" اور مسند میں مرفوعاً بیان کیا گیا ہے کہ "جو شخص اپنے ساتھی سے کہے چپ رہو پس اس کا جمعہ نہیں ہوا"

تین جمعے متواتر نہ پڑھنے والے کا سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔

اس مضمون کی احادیث انہی ابواب میں اس کثرت سے ہیں کہ ان کا شمار بھی مشکل ہے۔

سب سے پہلے یہ امر قابلِ غور ہے کہ خدا نے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کو محفوظ رکھنے اور مضبوط بنانے کے لیے ایک دن مقرر کر کے اس بنا پر اسے خصوصیت بخشی اور ثابت کر دیا کہ خصوصیت کا حامل مسلمانوں کا اجتماع ہے۔ ورنہ حضور کو کھڑا چھوڑ جانے والے قابلِ ملامت نہ ٹھہرتے۔ وہ اجتماع کو چھوڑ گئے تھے۔ جمعہ کے دن کی حدود سے باہر نہیں گئے تھے۔ جمعہ کا دن جمعہ کا دن ہی تھا۔

اب خیال فرمائیے کہ اگر جمعہ کا دن صرف دن ہونے کی حیثیت سے ان فضائل خصائص اور خیرات و برکات کا متحمل اور متضمن ہے جو اس سلسلے میں بظاہر وارد سمجھی جاتی ہیں تو جو شخص بلا عذر شرعی نمازِ جمعہ میں شامل نہیں ہوا وہ کیوں محروم رہ سکتا ہے؟

ایک شخص حضور اکرمؐ کے ہمراہ شامل ہو کر نمازِ جمعہ ادا کرتا ہے بلکہ قریب ہو کر خطبہ سننے کے شوق میں دوسرے نمازیوں سے آگے بڑھنے اور پہلی صف میں امام کے قرب پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ البتہ بدنظمی، بے قاعدگی اور اجتماعی بے ضابطگی کا مرتکب ہوتا ہے، اس جرم کی پاداش میں وہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ گویا اس نے جمعہ پڑھا ہی نہیں۔ ایک شخص ضبط و نظم کے مفہوم کو غلط فہمی کی بنا پر صحیح طور پر سمجھ نہیں پاتا اور اپنے خیال میں دوسرے کو چپ کرا کے ضبط کی کوشش کرتا ہے لیکن صرف اسی قدر ادب فراموشی یا فرض ناشناسی کی بنا پر جمعہ کے اجتماع میں شمولیت کے باوصف ثواب جمعہ بلکہ جمعہ سے محروم ہے۔

اس اصل حقیقت کی اس سے زیادہ کیا وضاحت ہو سکتی ہے کہ جمعہ کا دن، دن ہونے کی حیثیت سے خیر و برکات کا حامل نہیں بلکہ اُن بڑے بڑے واقعات نے جن میں آدم کا پیدا ہونا، خدا کے حکم کو بھول جانا، توبہ کرنا، توبہ کا قبول ہونا جو خلافتِ الٰہیہ کا متضمن تھا، مہبط الی الارض خدا کے تشریعی قانون کے نفاذ و قیام کی گراں وزن ذمہ داریوں کا سارا کائناتی نظم و نسق، حتیٰ کہ آئندہ قیامت تک کے واقعات، جب یہ ساری بساط لپیٹ دی جائے گی۔ یہ سارے واقعات و حالات اس اہمیت کا موجب ہیں جن کی طفیل اس جمعہ کے دن کو یا جمعہ کے دن کے نام کو وزن حاصل ہوا۔ اصل سبب محض انسانی عمل ہے اور بس۔ جس میں ذرا جتنی غفلت، فروگزاشت اور کوتاہی بھی سب کیا کرایا برباد کر دیتی ہے اور جمعہ کے دن کی موجودگی بلکہ ایک عاقل آدمی کے جمعہ میں شمولیت کے باوجود اسے کوئی نفع نہیں دیتی جمعے کا سورج اپنی تمام تر روشنی اور تابانیوں اور جمعرات کا چاند اپنی پوری ضوء فشانیوں کے

کے باوجود دیکھتا رہ جاتا ہے اور انسان اپنی چھوٹی سی عملی کوتاہی کے سبب سرتاپا تاریکیوں میں غرق ہو جاتا ہے۔

خدا کی مخلوق میں انسان ہی وہ ایک شخصیت اور وجود ہے جس کے اپنے عمل پر ہی اس کے نفع و نقصان، اس کی کامیابی اور بدانجامی، سزا و جزا اور جنت و دوزخ کے ثواب و عذاب کا دارومدار ہے۔ اس لیے کہ یہ جو کچھ کرتا ہے اپنے ارادہ سے کرتا ہے۔ اجرام سماوی کی طرح محض بے اختیار اور ایک ہی طرح کی مجبور زندگی کا پابند نہیں۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک بے اختیار کسی بااختیار کے حالات پر اثرانداز ہو اور اُس بااختیار کو نحوست و سعادت کا شکار اور تختۂ مشق بنالے۔ انسان کو اسی ارادہ اور قوتِ عمل نے مسجودِ ملائک ہونے کا شرف بخشا ہے۔

فروغِ آدمِ خاکی ز تازہ کاری ہاست

مہ و ستارہ کنند آں چہ پیش ازیں کردند

"خاکی انسان کا کمال و شرف محض اس کی تازہ کاری اور اختیار و ارادہ سے کام کرنے میں ہے ورنہ چاند اور ستارے تو وہی کچھ کر سکتے ہیں جو آج تک کرتے چلے آئے ہیں۔"

رہا وہم پرست لوگوں کا یہ خیال کہ ہر آدمی کی قسمت احکامِ نجوم کے مطابق خاص خاص سیاروں کے طلوع و غروب اور زوال و ہبوط سے وابستہ ہے، سو اس کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاف احکام موجود ہیں کہ ان پر ایمان لانا درست نہیں۔

ستارہ کیا میری تقدیر کی خبر دے گا

وہ آپ گردشِ افلاک میں ہے زار و زبوں

(نئی مزین) ۹ جمعہ کی عظمت و عزت اُس پُروقار اجتماعِ مسلمین میں ہے جس میں سردارِ قوم گزشتہ سات دنوں کے حالات پر تبصرہ کرتا ہے اور آئندہ سات دنوں کا پروگرام واضح کرتا ہے اور جب

طرح حضورِ اکرم ﷺ کے متعلق صحیح روایات میں وارد ہے کہ آپ "بحسب حاجۃ الناس" لوگوں کی ضروریات کے مُطابق خطبہ دیتے تھے۔ امام اسی طرح حسب ضرورت مسائل حاضرہ پر بحث کرے۔ عام مسلمان ضبط و نظم کو اس سختی سے قائم رکھیں کہ دوسروں کو چُپ کرانے کی بھی اجازت نہیں۔ ان اصل حقائق کی کس قدر وضاحت کی جائے ؟ ماحول سازگار نہیں نہ خطیب وہ خطیب ہیں جو قوم کے نیک و بد کا اپنے آپ کو نشو میں ایک درجہ ذمہ دار خیال کرنے کی حیثیت میں ہوں اور نہ قوم جمعہ کی سیاسی اہمیت کو سمجھنے کی سطح پر ہے۔ قوم کسی ادنی عمل کے بغیر صرف جمعہ کے دن کی خیر و برکت سے نفع اٹھانا چاہتی ہے اور قوم کے اماموں کی اکثریت ایسی ہے جو پیسے لے کر ہر بار کسی نئی مسجد میں جمعہ پڑھانا اور جہاں سے زیادہ پیسے ملیں وہاں پڑھانا ضروری سمجھتے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ نئی مسجد کے نمازیوں کے مسائل کیا ہیں اور وہاں کے عوام کی حاجت و ضرورت کیا ہے ؟ ؎

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے؟
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

دوسرا رُخ

اس میں شک نہیں کہ اسلام نے ستارہ پرستی کی تردید ایسے سادہ، قریب الفہم اور واضح دلائل سے کی ہے کہ ایک عام سے عام عقل و فکر کا آدمی بھی اس فریب میں نہیں آسکتا۔ کہ وہ ستارے، وہ چاند اور وہ سورج جن کی خُدائی سے مسلمانوں کے جدّامجد مُوحّدِ اعظم حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصّلوٰۃ و السلام نے عین اس ماحول میں انکار کیا جب حکومت سے لے کر ملک کے ایک ایک فرد بلکہ خُود ابراہیم علیہ السلام کے باپ اور سارے خاندان کا مذہبی عقیدہ ستارہ پرستی تھا، آج ابراہیم علیہ السلام کو سچّا نبی اور بانیٔ ملّت ماننے والے

ستاروں کی پرستش کو کس طرح قبول کر چکے ہیں؟ — لیکن جس طرح گزشتہ مباحث میں پڑھ ہو کر اس مورثِ اعلیٰ کے بعد بعض درمیانی ادوار میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہوتے رہے جنہوں نے شرک اختیار کیا، اسے رواج دیا اور آئندہ نسلوں نے اسے اپنا آبائی مذہب یقین کر کے ایسا سینے سے لگایا کہ اس کو چھوڑنا ان کے لیے مشکل ہو گیا۔ اور یہ دھوکا خود نسل ابراہیمی بالخصوص عرب میں آباد اسمٰعیلی شاخ نے بُری طرح کھایا۔

مُلکی اثرات

ہم ہندوستان کے رہنے والے لوگ تو اکثر ہیں ہی اُن لوگوں کی اولاد جن کا قدیم الایام سے عقیدہ مشرکانہ چلا آرہا ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد نے اسلام قبول کیا اور ان کے قبولِ اسلام میں زیادہ تر حصہ ان صوفیاء اور علماء حضرات کا تھا جو ایک جگہ ٹھہر کر مستقل سکونت اختیار کر کے دعوتِ و تبلیغ کا کام نہ کر سکے۔ مسلمان بادشاہوں نے بھی اس ملکِ ہند کو جسے مؤرّخوں نے سونے کی چڑیا کہا ہے شکار کرنے کی کوششیں کیں اکثر بار شکار کیا لیکن اس شکار کو توشۂ فتراک سے زیادہ حیثیت نہ دی۔ یہاں کی فتوحات کو وقتی کامیابیاں قرار دیا۔ مستقل سلطنت قائم کرنے پر کم توجہ دی۔ آئے اور مالِ غنیمت لیا، چلے گئے۔ ان وجوہات سے یہاں نہ کوئی قابلِ ذکر مرکز تبلیغ قائم ہُوا اور نہ کسی حکومت کی سرپرستی میں کوئی ایسی یونیورسٹی، تعلیمی اور تربیتی درسگاہ قائم ہوئی جہاں اسلام قبول کرنے والے ہندی نژاد لوگوں کی اسلامی طرزِ زندگی کے مطابق معاشی، معاشرتی، اخلاقی، دینی اور سیاسی تربیت ہوتی اور مسلمان ہونے والے پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاتے۔ زیادہ تر یہ عمل اسی حد تک پہنچ سکا کہ نومسلموں کے نام تبدیل ہو گئے۔ کچھ اور آگے بڑھے تو اسلام زندگی کا ایک پرائیویٹ معاملہ بن کر رہ گیا۔ جیسا مذہب کے متعلق یہاں کے لوگوں کا پہلے عقیدہ تھا۔ مکمل دستورِ حیات بن کر زندگی کے ہر شعبہ میں شامل ہونا اسلام کو نصیب نہ ہو سکا۔ یا نومسلموں کی قسمت میں نہ آیا۔ اکبر بادشاہ کو یہاں مستقل حکومت قائم

کرنے کا موقع ملا لیکن اس کی سیاسی مصلحتوں نے ہندو اکثریت کی استمالت اور دلجوئی ضروری خیال کرتے ہوئے ہندووانہ رسوم ورواج کو مٹانے کے بجائے الٹا ان کی حوصلہ افزائی اور تائید کی۔ یہاں تک کہ ہندو راجپوت عورتوں کو حرم میں داخل کیا اور ان کی پوجا پاٹھ کیلئے حرم سراؤں میں مندر اور بت خانے تعمیر کرائے۔ تاریخ ان دل خراش واقعات سے بھری پڑی ہے۔

علمِ نجوم کا اثر

ان حالات میں آبائی رسم ورواج میں کسی انقلاب انگیز تبدیلی کی کیا توقع ہوسکتی تھی؟ چنانچہ معاشی اور معاشری زندگی بڑی حد تک وہی رہی جو ہندو ہوتے وقت تھی۔

جمعہ، ہفتے کے سات دنوں میں ایک دن ہے۔ علمِ نجوم کے قواعد کے پیشِ نظر یہ سات دن سات سیّاروں کے نام پر ہیں۔ جمعہ کو شکروار کہا جاتا ہے۔ یہ سیارہ زہرہ کے نام پر ہے۔ جس طرح سنیچر یعنی ہفتہ زحل کے نام پر۔ اتوار سورج کے نام پر عیسائیوں نے بھی اسے سنڈے یعنی سورج کا دن ہی کہا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔

ذرا تفصیل سے سمجھ لیجئے۔ ممکن ہے یہ معلومات آگے چل کر بھی کام آئیں۔

نجوم والوں نے آسمان کو بارہ برجوں پر تقسیم کر رکھا ہے۔ حمل ۱۔ ثور ۲۔ جوزا ۳۔ سرطان ۴۔ اسد ۵۔ سنبلہ ۶۔ میزان ۷۔ عقرب ۸۔ قوس ۹۔ جدی ۱۰۔ دلو ۱۱۔ حوت ۱۲۔

کسی نے سہولت سے یاد رکھنے کے لیے ایک بیت میں سارے نام بیان کر دیے ہیں۔

چوں حمل، چوں ثور و چوں جوزا و سرطان و اسد
سنبلہ، میزان عقرب قوس وجدی و دلو و حوت

سورج، ایک برج میں ایک مہینہ یعنی جتنے درجے کسی برج کے مقرر ہیں اتنے دن اس برج میں رہ کر آگے بڑھتا ہے۔ اور اس طرح ایک سال میں آسمان کا پورا چکر طے کرتا ہے۔ بارہ برجوں میں ہر ایک برج کے مختلف درجے ہیں۔ کسی کے ۲۹، کسی کے ۳۰، کسی کے ۳۱

اور کسی کے ۳۲۔

یہ ہندی سن ماہ بیساکھ سے شروع ہوتا ہے۔ اس مہینہ میں سورج برج حمل میں ہوتا ہے جس کے ۳۱ دن ہیں۔ اور یہ مہینہ اکتیس دن کا ہوتا ہے۔ اسی طرح جیٹھ بھی ۳۱ دن کا اور پھر اساڑھ ۳۲ دن کا۔ اس کے بعد تین مہینے ساون، بھادوں اور اسوج تینوں کتیس کتیس دن کے۔ پھر کاتک اور مگھر دونوں پورے تیس تیس دنوں کے۔ اس کے بعد دو مہینے پوہ اور ماگھ انتیس انتیس دن کے۔ اور آخری دو مہینے پھاگن اور چیت پھر پورے تیس تیس دنوں کے۔

کسی نے حروف ابجی کے اعداد کے حساب سے ایک بیت میں ان مہینوں کے مختلف دنوں کا ذکر کر دیا ہوا ہے تاکہ آسانی سے یاد کیا جا سکے۔

لا و لا لب لا و لا لا شمش مراست
لل کط و کط لل مشہور کونہ است

جس طرح سورج سال میں آسمان کا پورا چکر طے کرتا ہے، اسی طرح چاند ایک مہینے میں پورے آسمان کا چکر لگا کے پھر اپنی جگہ پر آجاتا ہے۔ چاند پہلے آسمان پر ہے۔ اس کا مدار سفر سات سیاروں میں سے سب سے چھوٹا ہے۔ اس کے بعد عطارد، زہرہ، سورج، مریخ، مشتری اور زحل سات سیارے ایک ایک آسمان پر ہیں اور باقی تمام ثوابت آٹھویں آسمان پر۔ زحل تیس سالوں میں ایک چکر پورا کرتا ہے۔ ان کے مدارات بھی ایک بیت میں سنیئے:۔

قمر ست و عطارد و زہرہ
شمس و مریخ و مشتری و زحل

سورج اور چاند سمیت ان ساتوں سیاروں کی نسبتیں بارہ برجوں کے ساتھ مختلف ہیں کسی میں ان کا شرف سمجھا جاتا ہے اور کسی میں ہبوط کسی میں زوال کسی میں کمال۔ پھر برج بھی کوئی آبی ہے کوئی آتشی، کوئی خاکی ہے کوئی بادی۔

بہرحال ہفتے کے سات دن انہی سات سیاروں کے نام پر مقرر ہیں منگل مریخ کے نام پر ہے اس لیے منگل کو چڑھنے والا ہر سورج برج مریخ کا غیظ و غضب لے کر چڑھتا ہے ہفتے کے دن میں زحل کی نحوست لازم ہوتی ہے۔ اسی طرح زہرہ "شکروار" یعنی جمعہ کچھ سعادتیں لے کر آتا ہے۔ یاد رہے کہ ان برجوں میں سیاروں کی کچھ مفروضہ بلکہ معینہ شکلیں ہیں۔ زہرہ ایک خوب صورت عورت کی شکل میں ہے۔

اب خیال فرماؤ ایسے ملک کے لوگ اور اس ملک کے باشندوں کی وہ اولاد جو ہزارہا سال سے سعد و نحس کے ان عقیدوں کو نسل در نسل یاد رکھنے اور ان بنیادوں پر زندگی بسر کرتے چلے آرہے ہیں سورج دیوتے اور چندرماں کی غلامی سے کس طرح آزاد ہو سکتے ہیں؟ پھر اس حال میں کہ کوئی تربیت بھی نہ ہو، تعلیم نہ ہو، معاشری طور طریقے وہی، معاشی وسائل میں سرِ مو فرق نہ آیا ہو بلکہ اپنے ہی بے خبر راہنما بھی صبح و شام ایک ایک گھڑی پل اور ہر ساعت کا تعارف سعد و نحس ہی کے نام سے کرا رہے ہوں۔ جس صورت میں دنوں کا تعارف ہی نحوست اور سعادت کے نام پر ہو تو نام کے ساتھ ہی نحوست اور سعادت کا یقین کیوں شامل نہ ہوگا؟

ان بداعتقادیوں کا اصل حل

ان تمام بداعتقادیوں کا صرف ایک اور ایک ہی حل ہے کہ زمین و آسمان میں حاکمیت صرف خدا ہی کی تسلیم کر لی جائے اور پھر صرف زبان سے نہیں عملی صورت میں ساری کائنات کے اندر تصرف صرف اسی ذاتِ واحد کا مانا جائے اور زندگی سر تا پا اسی عقیدہ کے سپرد کر دی جائے۔ پھر یہ ساری طاقتیں مومن کی نگاہوں میں خود بخود پست دکھائی دینے لگیں گی سورج اور چاند واقعی خدمت گار نظر آئیں گے۔ بحر و بر پامال اور زیر فرمان بلکہ ادنیٰ خادم ثابت ہونگے جس طرح قرآن نے یقین دلایا ہے۔ معاملہ صرف عقیدے کی پختگی کا ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ عقیدے کا درست کرنا ہر چھوٹے بڑے اور ادنیٰ و اعلیٰ کے اپنے بس میں ہے ـــ بشرطیکہ

غافل انسان خدا کی عطا کی ہوئی اس سہولت اور خدا کے دیے ہوتے اس اختیار سے فائدہ اٹھا سکے۔ سارا مدار عقیدے پر ہے۔

بالائے سر رہے تو ہے نام اس کا آسماں
آجائے زیر پَر تو یہی آسماں، زمیں

اگر عقیدہ درست ہو جائے تو مومن کی دنیا یک سر تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کی دنیا کے شب و روز صرف خدا کی حاکمیت اور ایک ایسے ملک کے شب و روز ہوتے ہیں۔ جس میں خدا کی کبریائی اور عظمت اور خدا کی بادشاہی کے بغیر کسی دوسرے کی بادشاہی کا تصوّر تک باقی نہیں رہتا۔ یہاں سائنس دانوں کی قیاس آرائیوں اور فلسفیوں کی بھول بھلیوں میں پریشان ہونے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مومن کی صبح صرف ایک یقین افروز صدائے حق سن کر پھوٹتی ہے اور اسی یقین پر دن گزرتا ہے اور شام ہوتی ہے۔ یہ اُن مادی شب و روز کی دنیا کا غلام نہیں۔ بلکہ مسلمان کو روحانی دنیا کے خود خالق ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ؎

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

———— ✣ ————

عُرس

عرس عام تقریب کی حیثیت سے

موجودہ مسلمانوں کے معاشری رسوم آداب میں جو تقریبات منائی جارہی ہیں۔ ان میں بزرگانِ دین کے مزارات یا ان کے ناموں پر سالانہ عرس منانے کی تقریب کو سرِ فہرست ہونے کا فخر حاصل ہے اس لیے مناسب ہے کہ اس پر بھی اجمالی نظر ڈال لی جائے کیونکہ یہ تقریب بھی ایک معین دن اور تاریخ سے تعلق رکھتی ہے بلکہ ایک خاص تاریخ اور دن ہی اس تقریب کی بنیاد ہے اور یہی بنیاد ہمارا موضوع بحث ہے اور پھر اس تقریب کو عقیدت بلکہ خوش عقیدگی سے جس قدر تعلق ہے شاید ہی کسی تقریب کو ہوگا۔

عُرس کے لغوی معنی

(عرس عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی لغت میں "شادی" کے ہیں)۔ صراح میں عُرُس بالفتح کے معنی "زن و مرد نو خواستہ یک دیگر را" (مرد اور عورت کا نیا شادی شدہ جوڑا) اسی طرح اس لفظ کے مشتقات میں بھی شادی ہی کا مفہوم شامل ہے (غرض عرس کے معنی شادی ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔)

قابلِ غور سوال

اب غور طلب سوال یہ ہے کہ جس طرح عرس کے معنی متفقہ طور پر شادی ہے اسی طرح عرس کی تقریب کے لیے بھی بالاتفاق وہی دن، وہی تاریخ اور وہی بنیاد ہے جس دن کسی قابلِ ذکر ہستی یا جسے قابلِ ذکر سمجھ لیا گیا ہو، کی موت واقع ہوتی ہے موت کے دن اور پھر قابلِ ذکر شخصیت کی موت کے دن کو شادی کا دن قرار دے لینا اور قرار دیے جانا سال بسال اسے عین اسی حادثہ کے دن کی یاد کو عرس یعنی شادی کے نام سے یاد رکھنا اور اس یاد کو پورے اہتمام سے ہر سال پہلے سال سے بڑھ چڑھ کر تازہ کرتے رہنا۔ آخر اس تضاد کے کیا معنی ہیں؟ موت کو شادی قرار دینا "برعکس نہند نام زنگی کافور" سیاہ رنگ کے آدمی کا نام مکھن خاں، رکھ دینے کی تضحیک۔ اور ستم ظریفی ہے یا عقیدت کا اندھا فریب ہے؟ موت کہاں اور شادی کہاں؟

موت کیا ہے؟

(موت ایک ناگوار حقیقت ہے جس سے انسان کو مفر نہیں اور انسان کیا کسی ذی حیات متنفّس کو گوارا بھی نہیں۔ انسان کی بے اختیاری کے یہ دو نشان ایسے واضح ہیں کہ اس کی ساری زندگی کی بے بسی کا روشن مُرقع پیش کر دیتے ہیں نہ اس کی پیدائش اپنے بس میں ہے نہ موت۔ کسی نے کتنا درست کہا ہے:

لائی حیات، آئے۔ قضا لے چلی، چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے)

قرآن کریم کی وضاحت

موت کا ذکر قرآن کریم میں حسبِ موقع مختلف حیثیتوں اور صورتوں میں ہوا ہے۔

ہے۔ بہرحال اسے ایک یقینی حادثہ اور ناگزیر واقعہ کے معنوں میں بیان کیا گیا ہے جو ہو کر رہتا ہے خواہ کوئی کتنا بھی اس سے بچنا چاہے۔ سورۃ حجر کی آخری آیت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے:

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ ﴿٩٩﴾

اور اپنے پروردگار کی عبادت میں لگے رہو یہاں تک کہ تم کو امر یقینی (یعنی موت) پیش آئے۔

۲۔ کمزور ایمان والے لوگوں کی وہ کیفیت بیان فرماتے ہوئے جو حق کی حقانیت واضح ہو جانے کے باوجود حق کو قبول کرنے کی ناگواری کی صورت میں ایسے لوگوں پر طاری ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے اس کیفیت کو موت کی سی انتہائی کراہت سے تشبیہہ دی ہے۔

يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُونَ ﴿٦﴾

وہ لوگ (حق بات کے) ظاہر ہوئے پیچھے تمہارے ساتھ حق بات میں لگے جھگڑا کرنے (اور مارے ڈر کے پیچھے ہٹنے) گویا ان کو (زبردستی) موت کی طرف دھکیلا جا رہا ہے اور وہ (موت کو) آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

کیا اس کیفیت کو عرس (شادی) کا نام دیا جا سکتا ہے؟

۳۔ موت کی ناگواری اور ہولناکی کی شدت کا اثر جو صرف مرنے والے پر ہی نہیں اس کے دوست احباب، تیماردار اور لواحقین پر بھی موت کو دیکھ کر مرتب ہوتا ہے سورۃ قیامت میں قرآن کریم کی زبان صدق بیان میں سنیئے!

كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿٢٦﴾ وَقِيلَ مَنْ رَاقٍ ﴿٢٧﴾ وَظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿٢٨﴾

سنو جی! جب (جان بدن سے کھنچ کر) گلے کی ہنسلی تک آ پہنچے گی۔

وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۝ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ ۝ اور (مرنے والے کے بیماردار) چلّا اٹھیں گے کہ (ارے) کوئی جھاڑنے والا ہے؟ (تو اس کو آکر جھاڑے) اور اس (بیمار) کو یقین ہو جائے کا کہ (اب یہ (دنیا سے) مفارقت (کا وقت) ہے۔

اس ہیبت نشان منظر سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ موت کس قدر الم انگیز اور ہولناک حادثہ ہے جس سے مرنے والا ہی متاثر نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ منظر دیکھ کر ہر دیکھنے والا چلّا اٹھتا ہے۔ کسی بزرگ یا عزیز کی موت کے دن کو عرس (شادی) کا دن منانے والے عقیدت مندو! اگر مرنے والے سے تمہیں کچھ بھی ہمدردی ہے اور اس کے دکھ کو دکھ محسوس کرتے ہو تو ایمان سے کہو کہ یہ شادی کا دن ہے (جو تمہارے عزیز کے لیے انتہائی مصیبت ہے۔)

موت احادیث کی روشنی میں

۱۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

من مات فقد قامت قیامته — جو شخص مرتا ہے اس کے لیے قیامت قائم ہو جاتی ہے۔

اب مناظر قیامت کا تصور سامنے لاؤ اور اندازہ کرو کہ ہر مرنے والا قیامت جس کے سامنے ہوگی موت کے وقت کس حالت میں ہوتا ہے۔ قیامت کے مناظر کی تفصیل سے سارا قرآن بالخصوص تیرہ سالہ مکی زندگی میں نازل ہونے والا قرآن کریم کا زیادہ تر حصہ اسی تفصیل پر مشتمل ہے۔ ملاحظہ ہو:

۱۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ — لوگو! اپنے رب کے غضب سے بچو! حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا

يَوۡمَ تَرَوۡنَهَا تَذۡهَلُ كُلُّ مُرۡضِعَةٍ عَمَّاۤ اَرۡضَعَتۡ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمۡلٍ حَمۡلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمۡ بِسُكٰرٰى وَلٰـكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيۡدٌ ۝

زلزلہ بڑی ہولناک چیز ہے جس روز تم اسے دیکھو گے حال یہ ہوگا کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے سے غافل ہو جائے گی۔ ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا اور لوگ تم کو مدہوش نظر آئیں گے حالانکہ وہ نشے میں نہ ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب ہی کچھ ایسا سخت ہوگا۔

سورہ واقعہ میں فرمایا

اِذَا وَقَعَتِ الۡوَاقِعَةُ ۝ لَيۡسَ لِوَقۡعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝ اِذَا رُجَّتِ الۡاَرۡضُ رَجًّا ۝ وَّبُسَّتِ الۡجِبَالُ بَسًّا ۝ فَكَانَتۡ هَبَآءً مُّنۡۢبَثًّا ۝

جب وہ ہونے والا واقعہ پیش آ جائے گا تو کوئی اس کے وقوع کو جھٹلانے والا نہ ہوگا وہ تہ و بالا کر دینے والی آفت ہوگی۔ زمین اس وقت ایک بارگی ہلا ڈالی جائے گی اور پہاڑ اس طرح ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے کہ پراگندہ غبار بن کر رہ جائیں گے۔

پھر فرمایا:

يَوۡمَ يَفِرُّ الۡمَرۡءُ مِنۡ اَخِيۡهِ ۝ وَاُمِّهٖ وَاَبِيۡهِ ۝ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيۡهِ ۝ لِكُلِّ امۡرِىٴٍ مِّنۡهُمۡ يَوۡمَئِذٍ شَاۡنٌ يُّغۡنِيۡهِ ۝ وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ مُّسۡفِرَةٌ ۝

اس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔ اُن میں سے ہر شخص پر اس دن ایسا وقت آ پڑے گا کہ اسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہوگا۔

حدیث کی رُو سے ہر مرنے والے کے سامنے قیامت کے مناظر آ جاتے ہیں اور ان مناظر کی منظر کشی قرآن کریم نے اس تفصیل سے کی ہے کہ ہولناکی اضطراب و بے خودی اور دہشت انگیزی کا کوئی پہلو باقی نہیں رہ گیا۔ نمونتاً تین مقامات سے کچھ حقائق پیش کیے

سکتے ہیں۔ فرصت اور قسمت ہو تو قرآن کریم کا مطالعہ کرو۔ اندازہ ہو جائے گا کہ موت واقعی کس قدر ہادم اللذات (لذتوں کو تباہ کر دینے والا) حادثہ ہے اور اس حادثہ سے دوچار ہونے والا ضعیف البنیان انسان اُس وقت کس حالت میں ہوتا ہے۔ اگر اس کیفیت کا ایک فیصدی نہیں، ہزارواں حصہ کا احساس بھی مرنے والے کے عزیزوں، غم خواروں، متوسلین اور عقیدتمندوں یا کم از کم دوستوں اور واقف آشناؤں کو ہو تو وہ اس کی موت کے دن، وقت اور تاریخ کو شادی (عُرس) کے دن کا نام دے سکتے ہیں؟

۲۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند ابراہیم رض شیر خوارگی کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوتے۔ بچے کے آخری سانس ہیں۔ موت کی ہچکیاں آرہی ہیں اور معصوم جان والد مشفق رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی گودی میں ہے۔ حضورؐ کی ہمدردی میں جانیں نثار کرنے والے صحابہ کی ایک جماعت یہ دردناک منظر دیکھ رہی ہے۔ حضور مجسّم صبر و رضا خدا کے حکم کو ساری دنیا سے بڑھ کر برضا و تسلیم قبول کرنے والی واحد شخصیت کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں اور زبانِ مبارک پر یہ الفاظ ہیں:

انی بفراقک یا ابراھیم لمحزون	اے ابراہیم! میں تیری جدائی کے صدمہ سے سخت مغموم ہوں۔

ایک صحابی عرض کرتا ہے حضور! آپ تو رونے سے منع فرماتے ہیں؟ آپؐ جواب دیتے ہیں:

القلب یحزن والعین تدمع	دل غم کا احساس کرتا ہے اور آنکھیں آنسو بہاتی ہیں۔ (یہ فطرت کا عمل ہے)

البتہ میں جزع فزع سے اب بھی منع کرتا ہوں۔)

غور کرو کہ حضور سے بڑھ کر خدا کی رضا پر صبر کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ لیکن موت کا حادثہ حضورؐ کے دل کو بھی متاثر کرتا ہے یہاں تک کہ آنسو بہہ نکلتے ہیں اور زبان حقیقت

ترجمان جدائی کے غم کا اظہار کرتی ہے۔
انصاف سے کہو ان لوگوں کو کس کھاتے میں شمار اور درج کیا جائے جو موت اور
موت کے دن کو شادی (عرس) کا دن قرار دیتے ہیں؟ اور اس جرأت بے باکانہ پر فخر
کرتے ہیں؟

۳۔ ایک جنازہ کو سامنے سے آتا دیکھ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے
ہو گئے۔ ایک صحابی عرض کرتا ہے حضور! یہ تو فلاں یہودی کا جنازہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا
میں تعظیماً کھڑا نہیں ہوا موت کے دہشت ناک تصور کا اثر ہے۔
جو تصور سرورِ انبیاء جیسی کوہ وقار شخصیت کے دل کو ہلا دیتا ہے، اسے شادی
(عرس) کا دن قرار دینے والے مدعیانِ اسلام کے متعلق کیا رائے قائم کی جائے؟

۴۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی حالت یہ ہے کہ بایں ہمہ کہ آپ
اپنے آخری وقت میں اللھم بالرفیق الاعلی (رفیقِ اعلیٰ یعنی خدا سے ملنے کی آرزو
فرما رہے ہیں) چہرۂ مبارک کبھی زرد پڑ جاتا ہے اور کبھی سرخ۔ پانی کا باسن پاس پڑا ہے
اس میں ہاتھ ڈبو ڈبو کر چہرۂ انور کو تر فرماتے جاتے ہیں اور زبان پر یہ الفاظ ہیں: ان للموت
لسکرات (بیشک موت کی گھاٹیاں ہیں)

۵۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر صحابۂ کرام رضؓ کی حالت

سیدہ فاطمہ رضؓ نے اس حادثہ پر کہا:

"پیارے باپ نے دعوتِ حق کو قبول فرمایا اور فردوس بریں میں نزول فرمایا۔
آہ جبریلؑ کو خبرِ انتقال کون پہنچا سکتا ہے؟"

حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ نے اس سانحہ جانکاہ پر کہا:

"دریغ! وہ نبیؐ جس نے فقر کو غنا پر اور مسکینی کو تونگری پر اختیار فرمایا۔
حیف! وہ دین پرور جو گنہگار امت کی فکر میں کبھی پوری رات آرام سے نہ سویا۔

جس نے ہمیشہ بڑی استقامت و استقلال سے نفس کے ساتھ مجاہدہ کیا۔
جس نے منہیات کو ذرہ بھر بھی نگاہِ التفات سے نہ دیکھا۔
جس نے ابرِ احسان کے دروازے اربابِ فقر و احتیاج پر کبھی بند نہ کیے۔
جس کے ضمیر منیر کے دامن پر دشمنوں کی ایذا، و اضرار کا ذرہ بھر بھی غبار نہ بیٹھا۔
حیف! جس کے موتیوں جیسے دانت پتھر سے توڑے گئے۔
جس کی نورانی پیشانی کو زخمی کیا گیا۔

آج ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دنیا سے رخصت ہوا۔ (مدارج النبوۃ)

خبر وفات سے صحابہ رضؓ اس قدر سراسیمہ، حیران اور دیوانہ و سرگردان تھے کہ کوئی جنگل کو نکل بھاگا، کوئی ششدر ہو کر جہاں تھا وہیں رہ گیا۔
عمر فاروق رضؓ کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ اللہ کے رسولؐ نے ارتحال فرمایا۔
ابوبکر صدیق رضؓ گھر میں گئے۔ جسم اطہر دیکھا۔ منہ سے منہ لگایا۔ پیشانی کو بوسہ دیا۔ آنسو بہائے پھر زبان سے کہا:

"میرے ماں باپ حضورؐ پر قربان۔ واللہ! خداوند تعالیٰ آپ پر دو موتیں وارد نہ کرے گا۔ یہی ایک موت تھی جو آپ پر ہوئی تھی۔"

پھر مسجد میں آئے وفات کے اعلان کا خطبہ پڑھا۔ حمد و صلوٰۃ کے بعد کہا۔

"واضح ہو کہ جو کوئی شخص تم میں سے محمد (صلعم) کی عبادت کرتا تھا، وہ تو رحلت فرما گئے اور جو کوئی اللہ کی عبادت کرتا تھا تو بے شک اللہ تعالیٰ تو زندہ ہے اسے موت نہیں۔ اللہ نے خود فرمایا ہے۔ محمدؐ تو ایک رسول ہے اس سے پہلے بھی رسول ہو چکے۔ اگر وہ مر گیا یا شہید ہو گیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ ہاں جو کوئی ایسا کریگا تو اللہ تعالےٰ کا

کچھ نہ بگاڑ سکے گا اور اللہ تعالیٰ تو شکر گزاروں کو اچھا بدلہ دینے والا ہے"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو غسل دیتے ہوئے علی المرتضیٰ رضؓ یہ کہہ رہے تھے:

"میرے ماں باپ آپ پر قربان! آپ کی موت سے وہ شے جاتی رہی جو کسی دوسرے کی موت سے نہ گئی تھی۔ نبوت اور غیب کی خبر اور وحی آسمانی کا انقطاع ہو گیا۔ آپ کی موت خاص صدمۂ عظیم ہے کہ اب سب مصیبتوں سے دل سرد ہو گیا اور یہ ایسا عام حادثہ ہے، کہ سب لوگ اس میں یکساں ہیں۔ اگر آپ نے صبر کا حکم نہ دیا ہوتا اور آہ و زاری سے منع نہ فرمایا ہوتا تو ہم آنسوؤں کو آپ پر بہا دیتے۔ پھر بھی یہ درد لاعلاج اور یہ زخم لازوال ہی ہوتا۔ اور ہماری حالت بھی اس مصیبت کے مقابلے میں کمزور ہوتی۔ اس مصیبت کا علاج ہی نہیں اور یہ غم تو جانے والا ہی نہیں۔ میرے والدین حضورؐ پر نثار۔ پروردگار کے ہاں ہمارا ذکر فرمانا اور ہم کو اپنے دل سے بھول نہ جانا۔"

(کوئی شریف النفس انسان صحابہؓ کرام رضؓ کی جاں نثار مقدس ہستیوں کے اس دُکھ الم کو شادی (عرس) کا نام دے سکتا ہے؟ لیکن آج کے فدائیوں نے یوم وفات کے سوموار کو فراموش کر دیا اور یوم ولادت کے سوموار کو عید کا دن قرار دے کر عید میلاد کے جشن منانے شروع کر دیے۔

یاد رہے یہ جشن سب سے پہلے مسلمانوں میں ملک شاہ سلجوقی نے ۴۸۵ھ میں بغداد میں منایا ہے۔ یہ دنیا کے بادشاہوں کا سیاسی جشن تو لگتا ہے لیکن حضورؐ کے جاں نثاروں کی کوئی دینی تقریب ہرگز نہیں ہو سکتی۔)

۶۔ زندگی میں ایسے بے شمار واقعات دیکھے ہیں اور دیکھنے پڑے ہیں جن میں اپنے عزیزوں، بزرگوں اور دوستوں کو انتہائی بے بسی کے عالم میں بصد ناگواری اپنے سامنے

ہمیشہ کے لیے دنیا سے رخصت ہوتے اور داغِ جدائی دیتے دیکھا ہے۔

مجھے ۱۹ اپریل ۱۹۲۶ء کا وہ دن، تاریخ اور گیارہ بجے دن کا وہ وقت نہیں بھولتا اور وہ منظر آج اُسی طرح نظروں کے سامنے ہے۔ میرا چھوٹا بھائی عبدالواحد عین عالمِ شباب میں طاعون کے مُوذی مرض میں مبتلا ہُوا۔ آخری وقت آگیا، اس کا سر گودی میں لئے رکھا تھا۔ گھر کے افراد اور دوست احباب مایوس نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ مرنے والے نے بھی زندگی سے مایوس ہو کر میری طرف دیکھا اور آخری امید کے سہارے پر زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ: "بھائی جی مجھے پکڑلو۔" میں اس کے جواب میں کیا کہہ سکتا تھا، بے بسی میں ڈوبے ہوئے الفاظ میں جواب دیا: "عزیزا میں نے پکڑ تو رکھا ہے لیکن بے بس ہوں۔" اس کے بعد عزیز مرحوم نے اصل امیدگاہ کی طرف توجہ دی، کلمہ شہادت پڑھا اور جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔

کون سنگ دل ایسے دلدوز واقعات کو شادی (عُرس) کی تقریب کا نام دے سکتا ہے؟

موت کی عام دہشت

موت کی عام دہشت کا احساس ہر متنفّس کی فطرت میں شامل ہے۔ اسی طرح انسان جو خلاصۂ کائنات ہے، ذی عقل ہے۔ اس کے ظاہری اور باطنی حواس اسی احساس سے کس طرح غیر متاثر رہ سکتے ہیں۔ اگر زندگی ہر جاندار کو عزیز ہے تو اس سے بڑھ کر موت کی کراہت اور ناگواری کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟ یہی ایک جدائی شہادت اس حقیقت اور نفس الامری حقیقت پر شاہد کافی ہے۔

دوسرا رُخ

ا ان بدیہی حقائق کے باوجود جو قرآن، حدیث، تاریخی واقعات، آثارِ صحابہ اور خود

انسان کے فطری اور وجدانی شواہد سے ثابت ہیں۔ ہمارے موجودہ معاشرے میں "عرس" ایک ایسی متداول، مشہور، مروّج اور عام مشہود تقریب پائی جاتی ہے کہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی آبادی اور کوئی قبرستان بلکہ کوئی نگاہ میں آجانے والی پختہ تعمیر شدہ قبر ایسی نہ ہوگی جس پر عرس کی تقریب انجام نہ پائی ہو۔ یہاں تک کہ اگر یہ کہا جائے کہ کسی قبر کو پختہ تعمیر ہی اسی غرض سے کیا جاتا ہے کہ اسے سالانہ عرس کا اڈہ بنایا جائے۔ تو بے جا نہ ہوگا۔

ان تصریحات کی موجودگی میں کہ حضورِ اکرم ؐ اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں جو دعا بارگاہِ ایزدی میں پیش کرتے ہیں۔ اس کے الفاظ ایسے واضح ہیں جن الفاظ کے کوئی دوسرے معنے لینا ممکن ہی نہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

اللھم لا تجعل قبری عیدا

اے اللہ! میری قبر کو سال بسال میلہ (عرس) منانے کا مقام نہ بنانا۔

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ رسم کہاں سے آئی؟ اور موت کے حادثے کو شادی (عرس) کا نام بالکل متضاد معنوں میں کیوں دے لیا گیا ہے؟ اور مسلمان معاشرے میں اس کثرت سے یہ رواج کیوں چل نکلا ہے؟ اس رواج کے محرکات، موجبات اور اسباب کیا ہیں جن اسباب نے مسلمان کو ہر حقیقت فراموش کرا دی ہے؟

حقیقتِ حال

جس طرح کسی بوتل یا گلاس کو بالکل الٹ دینے اور اس میں موجود شے کو پورا پورا گرا دینے کے باوجود اس شے کی لاگ لپیٹ کے اثرات بوتل اور گلاس میں موجود رہتے ہیں بالکل اسی طرح ہندوستان میں اسلام قبول کرنے والے ہندوؤں نے قبولِ اسلام کے وقت اپنے پہلے مذہب کو ترک کرنے کا کھلا اقرار تو کیا لیکن سابق رسوم و آداب اور الف و عادات کو جو زندگی میں شامل تھے اور روزمرّہ کے معمولات بنے ہوتے تھے ان کے ترک کرنے اور

ماحول سے یک سر علیحدہ ہو کر اسلامی ضابطۂ حیات کے تحت بالکل ایک نئی زندگی اختیار کرنے کے لیے ان نومسلموں کو پورا موقع نہیں ملا۔

اسلام کسی قوم کسی خاندان، کسی خاص نسل یا کسی خاص ملک کے باشندوں کا نام نہیں بلکہ جس جس قوم، جس جس خاندان، جس جس نسل اور جس جس ملک کے باشندوں میں سے جس جس فرد نے اسلام قبول کیا اور اسلام کے عام اصول کا کاربند ہو گیا، وہ مسلمان سمجھا گیا۔ چنانچہ مسلمانوں میں بعض مسائل کے اختلاف کی ایک یہ وجہ بھی ہے کہ یہودیوں سے جو مسلمان ہوا وہ یہودیت کے معتقدات کا کچھ نہ کچھ اثر اپنے ساتھ لایا۔ تورات میں خدا کے تجسم کے تصورات زیادہ نمایاں تھے۔ اسلام میں اہلِ ظواہر کا مسلک اسی اثر کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح مسیحیت کی ساری بنیاد روح اللہ پر ایمان لانا تھا اس لیے ان میں اکثر مسائل کا تصور محض روحانیت پر مبنی تھا۔ اسلام میں آ کر بھی یہ اثر غالب رہا اور بعض حقائق کے وجود کو صرف روحانی حیثیت ہی سے تسلیم کیا اور کیے رکھا۔ حالانکہ اس وقت ان کی تربیت اور تہذیب کا کافی اہتمام تھا پھر بھی سابق زندگی کے اثرات کسی نہ کسی رنگ میں کم و بیش دکھائی دیے اور دکھائی دے رہے ہیں۔

لیکن ہندوستان کا معاملہ اس سلسلے میں اور بھی نازک تھا۔ یہاں ہزار سال سے زیادہ عرصہ مسلمانوں کی حکومت قائم رہنے کے باوجود کوئی مستقل علمی ادارہ، کوئی یونیورسٹی اور کوئی تربیت گاہ ایسی کسی حکمران نے قائم نہیں کی جہاں نومسلموں کو تہذیب و تمدن، معاشی اور معاشرتی حیثیت سے بھی پورا پورا مسلمان بننے کا موقع ملتا۔ بلکہ اس کے برعکس اکبر کو اگر مستقل حکومت کرنے کا موقع ملا تو اس نے اپنی سیاسی مصلحتوں کے تحت اپنے باپ ہمایوں کی ناکامیوں کا مداوا اسی صورت میں سمجھا کہ ہندو راجپوتوں کی دلجوئی کی جائے۔ اس نے ذبیحہ گاؤ کو حکماً بند کر دیا۔ ہندوانہ رسوم و عادات کی مخالفت تو رہی ایک طرف، الٹا خود ان رسوم کو پورے اہتمام سے ادا کرنے کی کوشش کی۔ بھدرا کرایا۔ دکھری بنائی، دیوالی کی دیپ مالا کا اہتمام کیا۔

دسہرہ، ہولی غرض ہر تہوار منایا۔ یہاں تک کہ خود بھی ہندو راجپوت عورت سے شادی کی اور ہندو کو اس قدر قریب کر لیا کہ اپنے بیٹے جہانگیر کے لیے بھی ہندوؤں سے رشتہ لیا۔ شادی کے وقت اس کی ڈولی کے بانس کو خود کندھا دیا۔ اور اسی پر بس نہیں ان ہندو رانیوں کے لیے شاہی محلات میں مندر تعمیر کرائے جن میں وہ اپنے طریقہ پر اپنے بتوں کی پرستش کرتی تھی۔

اس میں شک نہیں ابوالفتح شیرازی وغیرہ.. جیسے علمائے حق بھی موجود تھے لیکن مُلّا مبارک کے دو بیٹے ابوالفضل اور فیضی بلا کے ذہین علماء ایسے بھی اکبر کو مل گئے جنہوں نے صلح کل کی روح کا حامل دینِ الٰہی اکبر کے نام پر رائج کر دیا۔ اور اکبر کو اکبر ہی نہیں "اللہ اکبر" بنا دیا۔

ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں ہندوؤں کے رسوم ورواجات، ہندو طرزِ معاشرت اسلامی تہذیب میں تبدیل ہونے کے بجائے مسلمان حکومت کے زیرِ سایہ اور مضبوط ہوگئی اور ترقی ہوگئی۔

ہندو تہذیب و معاشرت

اب ہندو تہذیب اور طرزِ معاشرت کے بنیادی اصول پر غور فرمایئے:

(۱) ہندوؤں کے مُقنّنِ اعلٰے منو نے اپنی سمرتی کے چوتھے ادھائے (باب) کے شروع میں گرہست آشرم (معاشرتی قواعد) بیان کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ پیدائش سے لے کر تیس (۳۰) سال تک انسان ودّیا آشرم میں علم پڑھنے پڑھانے میں مصروف رہے اور پھر تیس (۳۰) سال سے لے کر ساٹھ سال تک گرہست آشرم کا زمانہ ہے۔ اس میں صحیح علم کے مطابق معاشرتی زندگی بسر کرے۔ بیوی بچوں کی پرورش کرے اور نگہداشت معاش کے ذرائع کھیتی، بیوپار، کسبِ ہنر، تجارت وغیرہ کو انجام دے اور پھر ساٹھ سال سے لے کر باقی زندگی کا تمام حصہ برہم چاریہ طریق پر گزارے۔ یعنی تارک الدنیا ہو کر جنگل میں چلا جائے جوگ لے لے اور جائیداد، اندوختہ افروختہ سب اولاد کے حوالہ کر دے۔ کسی چیز سے کوئی تعلق نہ رکھے۔

چنانچہ اس زندگی میں اس کی حالت یہ ہوگی کہ کپڑے اتار دے گا اور صرف ایک لنگوٹ کس لے گا، جٹیں رکھ لے گا اور بدن پر راکھ مل لے گا اور در بدر مانگ کر کھائیگا۔

ظاہر ہے کہ ایسی زندگی اجتماعی حیثیت سے سارے معاشرے پر ایک بے جا بوجھ بننے اور انسانی اخلاق کا مجرم بن جانے کے علاوہ اپنی اولاد، خویش اقرباء اور دوست احباب کے لیے کس قدر باعثِ ننگ اور موجبِ طعن ہوسکتی ہے اور ہوتی ہے۔

اور اگر کوئی ساٹھ سالہ ہندو ویدوں کی اس مذہبی ہدایت کو نظر انداز کرکے اپنی یہ زندگی گھر ہی میں رہ کر گزارنا چاہتا ہے تو مذہب کی نگاہ میں بے وقار ہوجانے کے ساتھ ہندو رواج کے مطابق جس میں عورتیں اپنے خسر سے پردہ کرتی ہیں ایسا وجود گھر کے لوگوں کے لیے ایک مصیبت بن جاتا ہے۔ کچھ بڑھاپے کی وجہ سے بےکار وجود ہوتا ہے اور کچھ پردے کے تکلف کی بنا پر اس کا گھر میں آنا جانا اور بڑھاپے کی کمزوری سے بقول "پیری و صد عیب" کئی قسم کی بیماریاں لے کر آخر گھر ہی میں بیٹھ جانا گھر والوں کے لیے ایک مستقل عذاب کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ ایک بوڑھے کا یہ بیکار وجود ایسا قابلِ نفرت ہوجاتا ہے جیسے نہ چھوڑے بنتی ہے نہ اہلِ خانہ کے لیے قابلِ برداشت ہوسکتا ہے۔ یہ سانپ کے منہ میں چھچھوندر بن کر رہ جاتا ہے۔ دیہی زندگی کے کسی واقف اور تجربہ کار نے گھر کی اُن عورتوں کی زبانی جو اس بوڑھے سے پردہ کرنے کے لیے بھی رسماً مجبور ہیں، ترجمانی کرتے ہوئے کیسے جامع الفاظ کہے ہیں جن الفاظ میں یہ نفرت اور حقارت کی یہ حقیقت پھوٹ پھوٹ کر نگاہوں کے سامنے آتی ہے۔ کہا ہے:

"باپو گل ٹل بنھ دیو ویڑھے وڑدا کھڑاک نہیں کردا"

(اس بوڑھے کے گلے میں کوئی "ٹل" (بڑا گھنٹہ) ہی باندھ دینا چاہیئے کیونکہ یہ گھر کی چاردیواری (آنگن) میں داخل ہوتے وقت کوئی ایسی آواز نہیں دیتا جس سے کم از کم اس کے اندر آنے کی اطلاع ہی ہوجائے۔"

(یہی وجہ ہے کہ اس حیثیت کا کوئی سن رسیدہ بوڑھا ہندوؤں میں مرتا ہے تو یہ لوگ خوشی مناتے ہیں، اس کی ارتھی پر سے پیسے، چھوہارے، پتاشے اور مٹھائیاں نچھاور کرتے ہیں اس کی موت کے صرف اسی ایک دن کو ہی شادی کا دن نہیں مناتے بلکہ اس تاریخ کو سال بسال برسی کے نام پر خوشی اور شادی کا دن مناتے رہتے ہیں جس میں راگ رنگ کی مجلسیں قائم ہوتی ہیں۔ عورتوں مردوں کے مشترک اجتماع ہوتے ہیں۔ کھانے تقسیم ہوتے ہیں وغیرہ اور اس تقریب کو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر منانے اور پُر رونق بنانے میں فخر محسوس کیا جاتا ہے اور بڑوں کی عزت کا نشان سمجھا جاتا ہے موت کے دن کو بالخصوص بوڑھوں اور معمّر آدمیوں کی موت کے دن کو شادی کا دن منانے کی اصل وجوہات یہ ہیں۔ یہ ہندوؤں کی رسم ہے مسلمانوں کی نہیں البتہ مسلمانوں یا نو مسلموں نے جہاں اور بے شمار رسوم وعادات اور زندگی کے طور طریقے ہندوؤں سے لیے ہی نہیں بلکہ اپنے آباؤ اجداد کے طریقے چھوڑے ہی نہیں۔ یہ رسم بھی مسلمانوں میں آگئی۔ البتہ کہیں کہیں کچھ نام تبدیل کرنے کا تکلّف ضرور کیا گیا ہے۔ مثلاً اسی تقریب کو برسی کے بجائے عرس، عرس مبارک اور عرس شریف وغیرہ نام دے دیئے اور عام بوڑھوں کی جگہ بزرگان دین کو رکھ لیا۔ ورنہ موت کہاں اور شادی کہاں؟ یہ نو مُسلم اسلام قبول کرکے بھی اسلامی تہذیب وتمدن اور معیشت ومعاشرت کے اصولوں سے غافل اور بدستور بے خبر رہے ہیں۔ جیسا کہ گزشتہ سطور میں اشارہ کیا گیا ہے۔

ہیں خواب میں ابھی وہ جو جاگے ہیں خواب میں

ایک گناہ دوسرے کا سبب بنتا رہتا ہے اور انسان اس پر اصرار اور فخر کرکے گناہ کی برائی کو الٹا خوبی ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے، اسی طرح ایک ناخوب خوب اور خوب ناخوب بن جاتا ہے)

موت، شادی کیسے بن گئی (ہندوؤں میں بیوہ کی شادی بدترین جرم اور

سوسائٹی میں باعثِ صد ننگ فعل سمجھا جاتا ہے۔ بیوہ خواہ جوان عورت ہی کیوں نہ ہو وہ دوسری شادی نہیں کر سکتی اور وہ مجبور ہے کہ سسرال ہی میں رہے اور ساری عمر متوفی خاوند کے بڑے بھائی جیٹھ یا چھوٹے بھائی دیور کی غلامی میں بسر کرے کسی شبھ (مبارک) کام میں شامل نہ ہو، زیب زینت سے پرہیز کرے وغیرہ وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ کئی ہندو عورتیں اس ذلیل حالت میں ساری زندگی بسر کرنے کے مقابلے میں موت کو ترجیح دیتی رہی ہیں اور مردہ پتی (خاوند) کے ساتھ ہی چتا میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر کے جل مرتی رہی ہیں جسے ہندوؤں میں "ستی" کی رسم کہتے ہیں اور اس انتہائی ظلم کا ذکر فخر سے کر کے ناخوب کو خوب بنانے کی سعی نامسعود کرتے رہے ہیں۔ (سے انگریزی دورِ حکومت میں قانونی جرم قرار دیا گیا اور رفتہ رفتہ یہ بدرسمی ختم ہو گئی۔ فطری جذبات پر ناواجب پابندی لگانا جرم تھا اُسے اختیار کر لینے کے بعد اس پر اصرار کیا اور اس کے بُرے نتائج پر فخر کر کے جرم کو عزت کا نشان بنانے کی کوشش کی۔)

جو قومیں خدا کے قانونِ فطرت سے محروم اور بے نصیب رہ کر خود ساختہ اصولِ زندگی پر عمل کرتی ہیں وہ صریح ظلم پر فخر بھی کر سکتی ہیں اور موت کو شادی کا نام دینے پر بھی مجبور ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ ایک گناہ دوسرے گناہ ہی کو جنم دیتا ہے۔

جہاں ستی کی رسم میں فطری جذبات پر ناواجب پابندی نے صریح ظلم کو فخر و مباہات کا نشان بنا دیا وہاں کسی ننگِ خاندان بوڑھے کی موت کو خوشی اور شادی کا دن قرار دے لینا کیا بعید تھا۔

(یہ ہے اصل حقیقت موت کے دن کو شادی یا بالفاظ دیگر عرس کا دن منانے کی۔)

۴۔ ان عرسوں اور میلوں کی تاریخیں اکثر ہندی سن و سال کے بکرمی سمت کے مطابق چل رہی ہیں جو مسلمانوں کے ہجری سن و سال اور قمری حساب سے بالکل مختلف ہیں۔ ہندی شمسی تقویم کے مطابق منائی جانے والی یہ تقریبیں رمضان کے احترام، ایام اللہ یعنے

ایامِ تشریق اور حج کے مناسک، عیدین اور یومِ عاشوراء کے آداب و وظائف کو پامال کرتی چلی جاتی ہیں۔ آخر انہیں اسلامی تقریبات کا نام کس طرح دیا جا سکتا ہے؟ اور اسلامی تمدن و معاشرت کا آئینہ دار کیونکر اور کس عقل و شعور کے تحت سمجھا جا سکتا ہے؟

۳۔ اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینے کے بعد کہ عرس کی رسم خالص ہندوانہ رسم ہے جو برسی کا نام عرس بدل کر مسلمانوں میں رائج ہو چکی ہے اور اس کے تحت موت اور بالخصوص بوڑھوں کی موت اور اس سے آگے بڑھ کر بزرگوں کی موت کے دن کو شادی (عرس) کا دن قرار دے لیا گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں بوڑھے ماں باپ کی عزت و احترام کی تاکید جو قرآن کریم نے مسلمانوں کو کی ہے اس پر غور کرنا چاہیئے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ایک مسلمان کے لیے کوئی گنجائش ہے کہ وہ اپنے ان بزرگوں کی خدمت سے تنگ آجاتے یا ان کی ایسی حالت ہو سکتی ہے کہ ان کی زندگی کے مقابلے میں ان کے متعلقین ہی ان کی موت کو ان کی زندگی پر ترجیح دینے پر مجبور ہوں اور ان کی موت کے دن کو شادی کا دن بنالیں۔

قرآن کریم کی تصریحات ماں باپ کے احترام میں

ا مسلمانوں نے مال خرچ کرنے کا طریقہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ فرمایا۔ قرآن کریم نے مال خرچ کرنے کا سب سے پہلا مصرف ماں باپ کی خدمت کو قرار دیا۔ اللہ فرماتا ہے:

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۭ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝

اے پیغمبر! تم سے لوگ پوچھتے ہیں کہ خدا کی راہ میں کب خرچ کریں تو ان کو سمجھا دو کہ جو مال بھی خرچ کرو وہ تمہارے ماں باپ کا حق ہے اور قریب کے رشتہ داروں اور یتیموں کا

اور محتاجوں کا اور مسافروں کا ا...

تم کوئی سی بھلائی بھی کرو گے تو اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔" (البقرہ : ۲۶)

۲۔ سورۂ بنی اسرائیل جو معراجِ نبوی کے ذکر سے شروع ہوتی ہے اور حضور اکرمؐ کا یہ وہ شرف و مجد ہے جو ہجرت کا پیش خیمہ اور مدینہ طیبہ میں پہنچ کر تاسیس حکومت الٰہیہ کے متعلق خاص ہدایات پر مشتمل ہے اور پھر اس سلسلہ میں چودہ احکام اسلامی حکومت کے بنیادی اصولوں کی حیثیت سے بیان فرمائے گئے ہیں، ان اہم اصولوں میں سے ایک اصل ماں باپ کی خدمت پر مبنی بھی ہے جسے صرف خدائے واحد کی عبادت کے سب سے اہم حکم کے ساتھ ہی دوسرے درجے پر بیان فرمایا گیا ہے۔ ذرا اس کی تفصیلات پر غور کرو کہ مسلمان بوڑھے ماں باپ سے کیا سلوک کرنے کا پابند ہے اور کہاں تک پابند ہے۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰـهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ۝

اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک نہ کر کہ تو سزاوار مذمت اور دھتکارا ہوا رہ جائے گا اور تیرے رب کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کرو۔ اگر وہ تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں ان میں سے ایک یا دونوں، تو نہ ان کو اُف تک کہو اور نہ ان کو جھڑکو، اور ان سے شریفانہ بات کہو اور ان کے لیے رحم دلانہ اطاعت کے بازو جھکائے رکھو اور دعا کرتے رہو کہ "اے میرے رب! ان پر رحم فرما، جیسا کہ انہوں نے بچپن میں مجھے پالا۔ تمہارا رب جو کچھ تمہارے

دلوں میں ہے اس سے خوب واقف ہے۔ اگر تم سعادت مند ہو گے تو وہ رجوع کرنے والوں کو بڑا بخشنے والا ہے۔" (سورۂ بنی اسرائیل - ۲۳)

یہی نہیں قرآن کریم میں اکثر جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید جیسے اہم حکم کی تعمیل کا ذکر فرمایا ہے اس کے ساتھ ماں باپ کی خدمت کی تاکید بھی فرمائی ہے۔ اس سے ماں باپ کی خدمت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۳۔ سورۂ لقمان میں بھی لقمان کی زبانی جہاں قرآن کریم نے شرک کو ظلم کہہ کر شرک سے منع کیا ہے، اس کے ساتھ ہی ماں باپ کے احسانات کا ذکر کر کے ادائے شکر کی تاکید فرمائی ہے۔

وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۗ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۳﴾ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ۗ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۱۴﴾ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۡ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾

یاد کرو جب لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا تو اس نے کہا: "خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا۔ یقین یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔" اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے (اسی لیے ہم نے اس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر کرو اور اپنے ماں باپ کا شکر بجالاؤ۔ میری ہی طرف

تجھے پلٹنا ہے لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا، تو ان کی بات ہرگز نہ مان۔ دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ، مگر پیروی اس شخص کے راستے کی کر جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔ پھر تم سب کو پلٹنا میری ہی طرف ہے۔ اس وقت میں تمہیں بتا دوں گا کہ تم کیسے عمل کرتے رہے ہو" لقمٰن ۲۱

ان آیات میں ایک خاص بات قابلِ توجہ ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ اگر ماں باپ ایسے مُشرک ہیں کہ وہ تجھے بھی شرک پر مجبور کرتے ہیں تو ان کی یہ بات نہ مان لیکن دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ۔ گویا مسلمان اپنے مُشرک بلکہ شرک پر اصرار کرنے اور مسلمان اولاد کو مُشرک بنانے کی جدوجہد کرنے والے ماں باپ کے ساتھ بھی نیک برتاؤ کرنے، اسے زندگی کی تمام تر سہولتیں بہم پہنچانے، خدمت کرنے اور نازلیست ہر قسم کا آرام مہیا کرنے کا قرآنی حکم کے تحت پابند اور عقیدت مندی سے پابند ہے کسی ناگواری سے مجبور یا مجبوری کی ناگواری کا شکار نہیں۔

اب فرماؤ کہ کوئی سچا مسلمان بوڑھے، بیکار، معذور حتیٰ کہ مشرکانہ عقیدہ رکھنے والے بلکہ اسے بھی شرک پر مجبور کرنے والے ماں باپ کی دل سے خدمت کرنے سے گریز کر سکتا ہے؟ اور اس کے لیے یہ بوجھ کسی وقت ناگوار ہو سکتا ہے کہ وہ ایک ہندو خاندان کی طرح ان کی موت کے دن کو شادی "عُرس" کا دن قرار دے۔ اور ان کے مرنے پر خوشی مناتے ہے؟

اسلام بِرّ و احسان اور عدل و انصاف کا دین ہے بلکہ دین کی اساس نصح خیرخواہی ہی خیرخواہی پر ہے۔ اس میں نہ رہبانیت اور ترکِ دنیا اختیار کر کے بلاوجہ اپنا بوجھ دوسروں پر ڈالنے کی اجازت ہے اور نہ کسی کے حقوق کے استحصال کی رخصت اور اباحت کی ذرہ بھر گنجائش۔ بلکہ اپنی کم مائیگی اور تنگ حالی کے باوجود دوسروں پر ایثار کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ قرآن کریم نے سچے مومنوں کی تعریف یا علامت یہ بتاتی ہے۔ وَيُؤْثِرُونَ

عَلٰی اَنْفُسِہِمْ وَ لَوْ کَانَ بِہِمْ خَصَاصَۃٌ" وہ ایثار کرتے ہیں اپنی جانوں پر اگرچہ وہ خود تنگ حال ہی ہوں"

غرض جس طرح اوپر تفصیل گزر چکی ہے یہ تمام بدرسمیاں جو ہندی مسلمانوں یا نومسلموں میں چلی آرہی ہیں۔ ہندو تمدن اور معاشرت کے اثرات ہیں۔ جنہیں مٹانے کی کوئی مستقل کوشش نہیں کی گئی۔ نہ کسی مسلمان حکمران کی طرف سے اور نہ کسی دینی اور اخلاقی رہنما کی طرف سے۔

مناسب نظر آتا ہے کہ یہاں "العصر" جلد ۲۳ کے شمارہ ۱۵-۱۶ میں شائع شدہ ایک مضمون نقل کر دیا جائے جو وقت کی ضرورت کے تحت ۲۲ جولائی ۱۹۷۱ء کو لکھا گیا تھا اور "اہل القریٰ" کے مستقل عنوان کے تحت شائع ہوا۔

"غیر ذمہ داروں کے غیر ذمہ دارانہ اجتماعات" — "ہندوستان کے فصلی جشنوں کا اسلامی ایڈیشن" — "مزارات پر منعقد ہونے والے میلے"

ہمارے زرعی ملک کے فصلی جشن جو فصل ربیع کی برداشت بلکہ اس سے بھی پہلے فصل کی تیاری کے وقت ہی سے شروع ہو جاتے ہیں، اس وقت پورے زور پر ہیں۔ ایک ایک دن میں مختلف مقامات پر کئی کئی فصلی جشن دیہاتی میلوں کی صورت میں منعقد ہو رہے ہیں۔

ان میلوں کی اصل بنیاد تفریح کے فطری جذبے کی وہ تحریک ہے جو تحریک محنت و مشقت کرنے والے کسی آدمی یا کسی طبقے میں مسلسل مشقت کی تھکاوٹ کے بعد کچھ وقت آرام کرنے، سستانے اور آسائش حاصل کرنے کی طبعی آرزو سے پیدا ہو جاتی ہے یہ آرزو اور کسک دیہاتیوں میں ان کی اس مشقت اور محنت کے بعد فارغ ہونے پر پیدا ہوتی ہے جو محنت دیہاتی لوگ فصل ربیع یعنی گیہوں کی کاشت کے وقت شروع نومبر (کتک) کے مہینہ سے لے کر وسط اپریل (بیساکھ) تک پورے چھ مہینے زمین کی تیاری،

بجائی، بار بار کی آبپاشی اور شب و روز کی محافظت و نگہداشت کی مسلسل کلفتوں کی صورت میں برداشت کرتے ہیں اور جس وقت فصل کی تیاری کی منزل قریب آ جاتی ہے، محنت کا دور ختم ہونا شروع ہو جاتا ہے اور گیہوں کے لہلہاتے کھیت سنہری بالوں سے لد جاتے ہیں اور اس زرعی ملک کے زراعت پیشہ دیہاتی باشندوں میں تفریح کے جذبات گدگدی لینا شروع کر دیتے ہیں۔ بلکہ ان پر سرور و سرمستی اور بے خودی کی واقعی وہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے جس کا نقشہ قرآن پاک نے کَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ الْکُفَّارَ نَبَاتُهٗ (بارش کی طرح جس سے (لہلہاتی) کھیتیاں کاشت کار کو سرخوش کر دیتی ہیں) کے الفاظ میں پیش کیا ہے۔

متحدہ ہندوستان کی دیہی طرزِ معاشرت پر یہی نہیں کہ صرف ہندوؤں کی موجودگی ہی میں ہندو تمدن اور رسوم و رواج کا اثر غالب تھا بلکہ ان کے ترکِ وطن کے بعد آج بھی یہ اثر بڑی حد تک پاکستانیوں کی عام زندگی، طرزِ بود و ماند اور معیشت و معاشرت پر اسی طرح غالب چلا آ رہا ہے (متحدہ ہندوستان میں ان جشنوں کا سلسلہ ہندوؤں کے ایک خاص تہوار بسنت پنچمی پر وسط ماہ ماگھ ہی سے شروع ہو جاتا تھا اور ہولی [illegible] کی رنگ رلیوں سے گزرتا ہوا بیساکھی یکم ماہ بیساکھ بہت بڑے جشن [illegible] پہنچ جاتا جس وقت فصل بالکل تیار ہو چکی ہوتی ہے اور پھر گرمی کا تقریباً سارا موسم [illegible] کی طویل محنت کے مقابلے میں اسی طرح طویل تفریح میں گزر جاتا۔

ہندوؤں نے ان مشترکہ قومی اور ملکی جشنوں اور میلوں کے انعقاد کے لیے اکثر اپنے سنتوں، پروہتوں اور مذہبی رہنماؤں کی سمادھوں اور استھانوں جیسے مشترکہ مقامات ہی کو منتخب اور مقرر کر رکھا تھا۔ یہ میلے چونکہ مذہب سے زیادہ معاشرتی حیثیت رکھتے تھے بلکہ فی الحقیقت ان کے بنیادی محرکات ہی چونکہ خالص طور پر موسمی تغیرات، فصلی پیداوار اور معاشی بست و کشاد پر منحصر تھے اس لیے ان میلوں میں دلچسپی لینے کے سلسلہ

میں عام جاہل مسلمانوں بالخصوص دیہاتی طبقے نے دینی پابندیوں کی بہت کم پرواہ کی اور ہمیشہ ہندوؤں کے دوش بدوش ان میں شامل ہوتے رہے۔ ملک کی آب و ہوا، موسمی اثرات اور زرعی پیداوار جیسی زندگی کی ضروریات کا ہندو مسلمانوں کی زندگی سے چونکہ ایک جیسا تعلق تھا، اس لیے یکساں تاثر کے مقابلے میں دیہاتی مسلمان اپنے دینی امتیازات اور اسلام کے معاشرتی آداب کی امتیازی خصوصیات کو محفوظ نہ رکھ سکا۔

ہندوؤں کے میلوں میں مسلمان کی اس شمولیت نے انہیں ہندوؤں کی زیارت گاہوں سے بھی بالواسطہ طور پر ہی سہی بڑی حد تک قریب اور مانوس کر رکھا تھا۔ اس قرب و انس یا کم از کم عام نفرت اور دینی عصبیت کی کمی ہی کا نتیجہ ہے کہ اس وقت مسلمان کسی دینی راہنما کے کہنے کہلانے سے ہندوؤں کی ان تقریبات میں شامل ہونے سے رکے بھی تو انہوں نے مسلمان بزرگوں کی قبروں اور مزاروں پہ علیحدہ میلے لگانے شروع کر دیے۔ گو بعض محتاط اور دانشمند افراد نے ان میلوں کے نام کسی کسی جگہ میلے کے بجائے عرس رکھ دیا۔ تاہم ان اجتماعات پر جو رسوم و آداب بجا لائے جاتے اور جو عوامل انجام پاتے۔ ان میں اور ہندوؤں کے ان میلوں میں جو مہنتوں، پروہتوں اور سادھوؤں کی سمادھوں پہ لگتے تھے۔ رسوم و آداب اور عوامل و حرکات کے لحاظ سے بال برابر فرق نہ تھا (وہی ڈھول تماشے، وہی راگ رنگ، وہی مردوں اور عورتوں کے مخلوط جمگھٹے، لوک ناچ، فحش گیت، بھنگڑے، اکھاڑے اور تمام غیر انسانی حرکات یہاں بھی اسی طرح موجود ہے۔ اگر کسی جگہ بڑا تکلف ہوا تو قوالی کے نام پہ عشقیہ گیت اور غزل خوانیاں، وجد و حال کے سائے میں رقص و سرود کی سرمستیاں اور عقیدت کے پردے اور رشد و ارشاد کے فریب میں مردوں اور عورتوں کے مخلوط مجمعے یہاں بھی لگتے رہے۔ ۔ ۔ (اخباری رپورٹوں کی صورت میں یہ خبریں آج بھی اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں کہ کئی کئی دن کئی کئی ہفتے بلکہ مہینوں بھر بڑے بڑے مشہور بزرگوں کے مزارات پر سینکڑوں کی تعداد میں طوائف جمع ہوتیں اور مجرے کرتی رہتی ہیں اور کئی کئی لاکھ کا جوا کھیلا جاتا ہے۔

عام مزارات پر تو عرس، قوالی وغیرہ کے لفظی تکلف کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ صاف میلے کے نام پر انتہائی غیر ذمہ دار اجتماعات منعقد ہوتے ہیں۔

اب ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں ہندوؤں کے ترکِ وطن کے بعد اس یورش کا رخ مکمل طور پر صرف بزرگانِ دین کی قبروں کی طرف پھر گیا اور ہندوؤں کے زمانے والے سمادھوں کے میلوں کا ساز و سامان اور فواحش و منکرات کا تمام شیطانی اسلحہ لے کر مسلمان ان مقدس مقامات پر پل پڑے ہیں۔ اور پوری قوت سے حملہ آور ہو چکے ہیں۔

ان میلوں کی تاریخیں بظاہر صاحب مزار بزرگوں کے یومِ وفات کو قرار دے کر ان تقریبات کا نام ختمِ قرآن اور ایصالِ ثواب وغیرہ کا عمل تجویز کرتے ہیں۔ لیکن "دروغ گو را حافظہ نباشد" (جھوٹے کا حافظہ کمزور ہوتا ہے) کے عام اصول کے تحت یہ حقیقت ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے کہ تمام بزرگوں کی موت صرف گرمی کے موسم ہی میں کیونکر ممکن ہے ان میلوں کے لگانے اور اجتماعات کے منعقد کرنے میں موسمِ گرما کی تخصیص بلکہ ہندی سن و سال کے مہینوں کی تاریخوں پر ہی ان میلوں کا لگنا صاف ظاہر کرتا ہے کہ یہ بزرگوں کی وفات کے دن نہیں بلکہ یہ موسمی جشنوں کی وہی ہندووانہ تقریبیں ہیں جو قدیم سے ہندوستان میں ہندو قوم ہمیشہ اپنے پیشواؤں کے تیرتھوں پر مناتی چلی آئی ہے۔ ورنہ مسلمانوں کی دینی روایات میں اس قسم کی تقریبات کا نام تک نہیں اور اس مصلحِ اعظم اور رہنمائے عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین میں اس نوعیت کی تقریبات کے لیے آخر گنجائش ہی کیا ہو سکتی ہے؟ جس کی دنیا سے رخصت ہوتے وقت بھی آخری دعا یہ تھی کہ:

رب لا تجعل قبری عیداً ط — میرے پروردگار! میری قبر کو سال بسال میلہ لگنے کا اڈا نہ بنانا۔

ان عرسوں اور میلوں کے موسمی اور فصلی جشن ہونے اور دینی روایات سے دور بلکہ منافی ہونے کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کی تاریخیں ہندی سن و سال

کے مطابق ہونے کی وجہ سے عیدین، حج، ایام تشریق اور ماہ رمضان میں بھی آتی رہتی ہیں۔ اور ان دنوں خاص کر رمضان المبارک کے احترام کو نظر انداز کر کے ان میلوں کی رونق دکانوں، کھیلوں، تماشوں اور رنگ رلیوں میں قطعاً کوئی فرق نہیں آنے دیا جاتا اور پھر وہ تمام طریقے اور انداز جن کے تحت یہ دن منائے جاتے ہیں ان طریقوں کو کسی محترم بزرگ راہنما کی موت کے حادثے اور اس حادثے کے رنج و الم اور احساس محرومی سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ کہاں یہ جشن اور میلے اور کہاں راہنمائے دین کی موت جسے ایک پورے جہان کی موت قرار دیا جاتا ہے۔

خاص خاص بزرگوں کے نام سے منسوب اور ان کی قبروں پر منعقد ہونے والے یہ میلے ناموں اور مقاموں کی نسبت کے باوجود اپنی شکل و صورت، رنگ ڈھنگ اور اپنی غیر شرعی غیر اخلاقی بلکہ غیر انسانی ہیئت کذائی کے لحاظ سے ان مقدس ناموں کی بدنامی اور ان قابل احترام مقامات کی بے حرمتی کا سامان تو مکمل طور پر بنے ہوئے ہیں لیکن حقائق کی روشنی میں ان تقریبات اور اجتماعات کو بزرگوں کی قبروں اور بزرگوں کی زندگی، زندگی کی روایات، وفات اور وفات کے نتائج و اثرات سے ان حرکات و عوامل کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ سر تا پا ہندو تمدن کی یادگاریں ہیں، ہندو معاشرت کے رسم و رواج ہیں یا ہندو مہنتوں اور پروہتوں کی برسیوں کے تہوار ہیں اور ان تہواروں کے رسوم و آداب ہیں۔

لیکن اب یہ میلے اور جشن بھی نہیں رہ گئے۔ بلکہ مسلمانوں کی اندھی عقیدت نے مزارات کی اس کھلی توہین کو احترام کا نام دے رکھا ہے اور ان میلوں کو مشرف باسلام کر لیا گیا ہے۔ اس لیے ان کے اس "اسلامی ایڈیشن" پر اعتراض کی گنجائش بھی بہت کم رہ گئی ہے۔

الغرض ہر چیز کو نظر انداز کر کے ان غیر ذمہ دارانہ اجتماعات میں عمل میں آنے والی ان بے ہودہ اور غیر ذمہ دارانہ حرکات پر بھی غور کیا جائے تو معاشرے پر مرتب ہونے والے ان کے برے اثرات اس قدر گہرے، اتنے دور رس اور اتنے تباہ کن نظر آئیں گے جن کی تلافی

کوئی بڑی سے بڑی اصلاحی کوشش نہیں کر سکتی اور اس کا علاج صرف یہی نظر آتا ہے کہ ان اجتماعات کو یک سر ختم کر دیا جائے اور بیخ و بُن سے اکھاڑ دیا جائے۔

انسانی زندگی کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ عمل ایسا نہیں جس کی ذمہ داری کوئی فرد قبول نہ کرتا ہو۔ جماعتیں افراد کے اعمال کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔ گھر کا بڑا آدمی باقی افراد کی ذمہ داری سے انکار نہیں کر سکتا۔ ہر ادارے کا سربراہ دوسرے کارکنوں کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسی طرح حکومت کے نظم و نسق میں اوپر سے لے کر نیچے تک بہ ترتیب درجہ بدرجہ ذمہ داریاں تقسیم ہیں اور سر رشتہ ہیں لیکن یہ دیہاتی میلے ہر نظم، ہر ضبط اور ہر چھوٹی بڑی دینی، اخلاقی، معاشرتی، معاشی غرض ہر نوع کی ذمہ داری سے ایسے مستثنیٰ ہیں جیسے کچھ وقت کے لیے کسی حکومت کی حدود میں کوئی غیر ملکی آوارہ فوج آداخل ہو۔ جس کا اپنا بھی کوئی سپہ سالار نہ ہو۔ ایسی جمعیت جس کا نصب العین پریشانی پیدا کرنا ہو، ایسا اجتماع جس کا ہر غیر ذمہ دار فرد دوسرے کی جمعیت خاطر کا بھی دشمن ہو۔ یہ ایسے مہمان ہیں جن کے بلانے اور میزبان بننے کی ذمہ داری لینے کے لیے بھی کوئی تیار نہ ہو۔ انہیں بٹھانے ٹھہرانے کا ذمہ کون لے گا؟ آنے والوں کی تعداد معین نہیں جو چاہے آئے، آکر جو چاہے کرلے۔ جو چاہے کہے، جہاں چاہے بیٹھے، جس طرح چاہے چلے پھرے حتیٰ کہ ناچے کودے اور جب چاہے چلا جائے۔ میلے کی جگہ کسی بزرگ کے مزار کا احاطہ ہے جو کسی کی ملکیت نہیں۔ صاحب مزار خود دوسری دنیا میں ہے۔ یہاں کا ڈیرے دار ملنگ دنیا جہان کی غیر ذمہ داریوں کا مجموعہ اور مجسمہ اور آوارگی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ غرض جس حیثیت سے ان اجتماعات کو دیکھو ذمہ داری نام کو نظر نہ آئے گی۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ یہاں پہنچ کر حکومت بھی اپنی گراں وزن ذمہ داریوں سے یکسر دست بردار ہو جاتی ہے۔ یہاں کوئی پولیس آفیسر آ بھی جائے تو اس کی حیثیت دوسرے میلہ دیکھنے والوں سے مختلف نہیں ہوتی اور وہ انہیں میں کا ایک ہوتا ہے۔ سعدیؒ نے سچ کہا ہے:

قاضی ار با ما نشیند بر فشاند دست را — محتسب گر مے خورد معذور دارد مست را

(اگر اس وقت قاضی بھی ہم میں بیٹھ جاتے تو ہماری طرح ناچنے لگے محتسب اگر شراب پی لے تو مستوں کو معذور قرار دے)

جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے آجکل ہمارے ملک میں بالخصوص ملک کی ۸۰ فیصدی دیہی آبادی میں ان اجتماعات کا موسم چل رہا ہے۔ چار پانچ دیہات میں ایک گاؤں ایسا ضرور ہو گا جہاں کوئی نہ کوئی میلہ لگتا ہے اور ہزارہا کی تعداد میں علاقہ کے غیر ذمہ دار افراد پوری غیر ذمہ داری سے وہاں جمع ہوتے ہیں لیکن مارشل لاء کی حکومتوں کے دور میں بھی ان اجتماعات پر کوئی پابندی نہیں۔ حالانکہ دوسری طرف کوئی اخلاقی، دینی، اصلاحی اجلاس بھی ایسا نہیں جو ان دنوں حکومت کی خاص اجازت کے بغیر کھلی جگہ پر منعقد ہو سکتا ہو۔ ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیئے۔

پری نہفتہ رُخ و دیو در کرشمہ و ناز
بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

حجؐ کی تقریب

حج عملِ مسلسل ہی کا دوسرا نام ہے کسی خاص دن کی محض یاد نہیں

کسی خاص دن کی بنا پر کوئی عمل تجویز نہیں کیا جاتا بلکہ کسی خاص عمل کی اہمیت کی بنیاد پر کوئی دن خصوصیت حاصل کر لیتا ہے اور یادگار بن جاتا ہے۔ کیونکہ فضیلت کی اہمیت، صلاحیت اور خصوصیت عمل پر منحصر ہے۔ وقت پر نہیں۔ جیسا کہ گزشتہ مباحث میں واضح ہو چکا ہے۔

حجؐ بھی ایک اہم تقریب ہے اور ملتِ ابراہیمیؑ میں سب سے قدیم یادگار دن چلا آتا ہے۔ لیکن اس دن کو یاد رکھنے اور یادگار بننے کی صلاحیت ان اہم واقعات اور خدا کی برگزیدہ شخصیتوں کے بلند قدر اعمال کی وجہ سے ہی حاصل ہوئی ہے جو عمل چاند کی غیر معین ہر موسم سے آزاد، روئے زمین کے ہر ملک میں چل پھر کر اور ادل بدل کر آنے والی تاریخوں میں وقوع پذیر ہوتے۔ قرآن نے فرمایا ہے:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ	اے پیغمبر! یہ لوگ تجھ سے چاند کے بڑھنے گھٹنے کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دو یہ لوگوں کو وقت

بتانے اور حج کی اطلاع دینے کے لیے ہے۔

گویا جن تاریخوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حج اور مناسکِ حج ادا کیے، قربانی کی ان ایمان افروز اعمالِ صالحہ کی یاد چاند کی یہ تاریخیں یاد کرا دیتی ہیں۔ موسم سردی کا ہو، گرمی کا ہو، برسات کے دن ہوں خواہ خشک موسم ہو۔ ان اعمال کی یاد یکساں طور پر نیکی کی تحریک پیدا کر دیتی ہے اور ایک تازہ ولولہ ملتِ ابراہیمی ع کے ہر فرد کے دل میں اُبھر آتا ہے۔ خواہ وہ دنیا کے کسی ملک میں ہو اور ملک کے کسی حصہ میں آباد ہو۔

عملِ حج کے اثرات

ایامِ حج کے ان بے شمار مبارک تاثرات اور مفید نتائج میں سے چند ایک حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ انسانی معاشرے کی ترقی کا دارومدار قومی اجتماع پر ہے۔ کیونکہ دوسرے تمام حیوانات کے برعکس انسان کی زندگی انفرادی نہیں، اجتماعی ہے۔ یہ جس وقت تک ایک دوسرے سے تعاون نہ کرے، کوئی ایک فرد تنہا ایک لمحہ زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ ایک آدمی اگر یہ خیال کرے کہ وہ اپنے سارے کام اور تمام ضروریاتِ زندگی کسی دوسرے کے تعاون کے بغیر خود پوری کر لے گا تو اس خیال اور ارادے کی تکمیل مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے۔ اس لیے اسے زندگی بسر کرنے کے لیے لامحالہ اجتماعی سطح پر سوچنا پڑے گا۔ ا

انسانی کائنات کے ابتدائے آفرینش ہی سے انجمنوں کی تشکیل اور اجتماعات کا انعقاد انسانی تہذیب و تمدن کی شرطِ اول رہی ہے۔ اسلام نے اس سلسلہ میں ساری دنیا سے بہتر اور برتر ایسے مستقل سامان مہیا فرمائے ہیں اور اجتماعات کی بنیاد ایسے روحانی پائدار محرکات پر رکھی ہے جن میں امتدادِ زمانہ سے کسی زوال اور اضمحلال کا شائبہ تک نہیں آ سکتا۔

اہلِ محلہ کے روزانہ اجتماع کے لیے پانچ وقت کی نماز باجماعت کو واجب قرار دیا۔ رات کو سب لوگ بالعموم اپنے اپنے گھروں میں آرام کرتے ہیں۔ رات میں پیش آنے والے انفرادی واقعات میں اگر دوسروں کی ہمدردی اور تعاون کی ضرورت ہے تو صبح کی نماز فجر کی

جماعت میں یہ سہولت مہیا ہے۔ اب کاروبار کی مصروفیت اور بازار کی آمد و رفت شروع ہوئی مختلف خارجی معاملات سے سابقہ پیش آیا تو دوپہر کے بعد نماز ظہر کا وقت آگیا۔ نمازِ عصر سارے دن کی مصروفیتوں کے ختم ہونے کے وقت سامنے آتی ہے۔ کاروباری لوگ، تجارتی کاروبار سے فارغ ہوکر، اہل حرفہ اپنے اپنے کام سے اٹھ کر اور مزدور مزدوری سے کام چھوڑ کر ابھی گھر نہیں پہنچے، اس وقفے کے معاملات پر اگر ہمدردی کی ضرورت ہے تو نمازِ عصر کا وقت ان معاملات پر اجتماعی حیثیت سے غور کرنے کے لیے بہترین موقع ہے۔ شام کو جب گھر پہنچے تو سارے دن کی غیر حاضری میں پیش آنے والے گھر کے حالات اور واقعات میں اگر کوئی بات اجتماعی حل کی محتاج ہے تو نمازِ مغرب کی جماعت کا اجتماع اس کے لیے نہایت موزون موقع ہے۔ اب رات گھروں میں آرام کرنے کا وقت آگیا ہے۔ نمازِ عشاء اس الوداعی رخصت کے لیے ایسا موزون اور دن کی ساری نمازوں کی نسبت زیادہ طویل وقت موجود ہے جس میں سارے دن کے حالات پر باہمی سیر حاصل بحث ہو سکتی ہے۔

ہر روز پانچ وقت کے اجتماعات میں اگر سارے شہر کے تمام لوگوں کو جمع ہونے کی تکلیف دی جاتے تو یہ تکلیف مالا یُطاق ہی ہو گی۔ اس لیے تمام شہر کے لوگوں کو ہفتے میں ایک دفعہ جمعہ کے دن جامع مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیا گیا۔ لیکن اس بڑے اجتماع کے لیے حفظِ صحت کا اہتمام بھی ضروری تھا۔ اس لیے نہانا، کپڑے بدلنا، لہسن، پیاز جیسی بدبودار اشیائے سے پرہیز اور خوشبو استعمال کرنا بھی ضروری قرار دیا گیا۔ اس کے لیے وقت دوپہر کا مناسب سمجھا گیا موسوی شریعت کے اس شدید حکم کے بجائے کہ سبت کے سارے دن میں کوئی کام کرنے والے کو جلا دیا جاتے۔ اسلام جیسے عالمگیر دین میں جمعہ کی اذان سن کر آنے اور نماز ادا کر لینے کے بعد اپنے اپنے کاروبار پر چلے جانے کا حکم دیا گیا اور پھر کثرتِ ہجوم کے پیشِ نظر بہ رعایت بھی دے دی گئی کہ چار رکعت کی جگہ صرف دو رکعت پڑھی جائیں۔ خطیب کو حکم دیا گیا کہ وقت کی ضرورت کے مطابق عوام کو خطاب کرے۔

قصبات کے اجتماع کے لیے عید کی نماز تجویز ہوئی۔ چونکہ یہ اجتماع جمعہ کی نسبت بھاری بھی تھا اور سال میں صرف دو دفعہ ہوتا تھا، ہجوم کی کثرت اور حفظ صحت کو مدنظر رکھتے ہوئے لباس کا تبدیل کرنا، نہانا اور خوشبو وغیرہ کا حکم جیسا کہ جمعہ میں تھا۔ یہاں بھی مناسب اور ضروری قرار دیا اور زیادہ اجتماع کے لحاظ سے حکم ہوا کہ یہ اجلاس باہر میدان میں منعقد ہو۔ تاکہ کھلی اور تازہ ہوا سے فائدہ اٹھایا جا سکے اور پھر دھوپ کا خوف تھا، اس لیے اس اجتماع کے لیے دن کا پہلا پہر وقت مقرر کیا۔

اس عام اجتماع میں روحانی محرک بلکہ اصل الاصول اور بنیادی غرض وغایت دو رکعت نماز ہے اور بعد میں وقت کی ضرورت کے مطابق خطبہ۔

دنیا کی تمام مہذب قوموں میں میلوں منڈیوں کا رواج موجود ہے لیکن دنیا بھر کے تمام میلے اور ہر ملت ومذہب کے تمام اجتماعات اور اجلاسوں پر غور کرو۔ صاف نظر آئے گا کہ یہ سب محض لہو ولعب کے سامان ہیں یا کچھ کاروباری دھندے۔ مگر اہلِ اسلام کے یہ اجتماعات، خالص توحید کے عقیدے کی نشر واشاعت اور ذکر الٰہی اور اعلائے کلمۃ اللہ کا ذریعہ ہیں۔

اب آخری سطح پر ساری دنیا کے اہلِ اسلام کے لیے ایک بین الملکی ہمہ گیر اجتماع کی ضرورت تھی تاکہ تمام شہروں اور مختلف ملکوں کے مسلمان تمام مادی تعلقات سے مضبوط تر اسلام کے روحانی رشتہ میں منسلک ایک جگہ اکٹھے ہو سکیں اور اس ایک واحد مؤتمر میں تمام عالم اسلام کا نیک وبد سوچ سکیں۔ سو اس کے لیے حج کا اجتماع مقرر ہوا۔

ایسے اجتماع کے لیے اول تو کل اہلِ اسلام کا اکٹھا ہونا اور امیر وفقیر کا پہنچنا مشکل تھا۔ دوسرے فقرا اور محتاجوں کے جانے میں کوئی زیادہ فائدہ مرتب ہونے کی امید بھی نہ ہو سکتی تھی۔ اس لیے حکم ہوا کہ:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ

اور لوگوں کے واسطے بیت اللہ کا حج ہے اس شخص کے لیے جو وہاں

تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہے۔

اور پھر یہ بھی بدیہی امر ہے کہ طبقۂ اُمرا میں عیش و عشرت، آرام طلبی اور کبر و نخوت ہی وہ مہلک امراض ہیں جو ہر قسم کی ترقی کے منافی ہیں۔ دور دراز کا سفر کرنا، احباب و اقارب اور بال بچوں کی جدائی، سردی اور گرمی کی تکلیف کو برداشت کرنا اور مختلف شہروں اور ملکوں کے علوم فنون اور قسم قسم کے مذاہب اور ملک ملک کے رسوم و عادات کی واقفیت حاصل کرنے پر محنت کرنا، سستی اور نفس پرستی کے استیصال کے لیے بہترین علاج ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ایک ملک کے فوائد کو دوسرے ملک تک پہنچانے میں جس قسم کی طاقت اور جیسے وسائل دولت مندوں کو حاصل ہیں ویسے غریب طبقہ کو میسر نہیں۔ اس لحاظ سے بھی دولت مندوں ہی کے لیے سفرِ حج موزوں تھا۔

اس اجتماع کے لیے مکان کونسا ہو؟

اس عالمگیر اجتماع کے لیے کونسا مقام مناسب تھا؟ سو اس کے لیے مکہ معظمہ سے بڑھ کر کوئی مقام زیادہ موزوں و مناسب نہ تھا۔ کیونکہ اول تو یہ مقام توحید اور اسلام کا مبدا ہے۔ دوسرے یہاں خدا کے ایسے مخلص بندوں کے عملی کارناموں کی یادیں اور یادگاریں ہیں جن کی کوششوں، قربانیوں اور جاں فشانیوں نے سخت سے سخت ماحول اور بڑی بڑی جابر طاقتوں کے مقابلے میں جانیں لڑا کر شرک اور بُت پرستی کا استیصال کیا اور توحید خالص سے دنیا کو آگاہ کیا۔

اشاعتِ اسلام اور عقیدۂ توحید کے رواج و شیوع کے سلسلہ میں انسانی تاریخ کے اندر جو محیّر العقول انقلابات وجود میں آئے ہیں ان کا مرکز یہی شہر تھا۔ اگر کوئی سے یادگار کی صورت میں جوش دلانے والی اور نیکی کی محرک بن سکتی ہے تو سرزمین اُمّ القُریٰ (مکہ مکرّمہ) اور حرم کعبہ کی مقدس فضا سے بڑھ کر کوئی نہیں۔

اُمرا کے ساتھ جن پر حج فرض ہے ممکن بلکہ ضرور تھا کہ ان کے نوکر چاکر بھی سفرِ حج میں ان کے شریک سفر ہوں اور پھر یہ بھی ضروری تھا کہ کچھ لوگ غربا میں سے بھی بے نوائی کے باوجود مجبورِ محبت ہو کر وہاں پہنچ جائیں۔ اس لیے اسلام نے اہلِ اسلام میں یک جہتی اور اتحاد و یگانگت کو عملی صورت میں حدِ کمال تک پہنچانے کے لیے تجویز فرمایا۔ کہ سب لوگ سادہ دو چادروں پر اکتفا کرکے امیر و غریب یکساں سر سے ننگے، کرتے سے الگ ایک جیسی سادہ وضع پر نظر آئیں تاکہ ان کی یکتائی اور ان کا اتحاد عملی صورت میں درجۂ کمال تک پہنچے۔

اس حالت کا نام احرام ہے۔ کچھ عقل و حُسن اس کا سن چکے ہو، کچھ اور سن لو۔ زیب و زینت اور تن آرائی کی پہلی منزل حجامت بنوانا اور بال کٹوانا ہے جس کی ان ایام میں قطعی ممانعت ہے جو وضع کے پابندوں کو محال نظر آتی ہے۔

پھر اس مسجد میں ابراہیمی عبادت کی طرح پر ایک عبادت ہے جسے طواف کہتے ہیں پروانہ وار چند بار مسجدِ حرام کے گرد گھومنا۔

پھر صفا اور مروہ کے درمیان بیادگارِ اُمِّ اسمٰعیلؑ حضرت ہاجرہ علیہا السلام چلنا۔ سیّدہ ہاجرہؑ کو ابراہیم علیہ السلام نے یہاں چھوڑا تو انہوں نے ابراہیمؑ سے پوچھا تو ہمیں کس کے سپرد کرتا ہے؟ ابراہیمؑ نے کہا۔ خدا کے سپرد کرتا ہوں اور اسی کے حکم سے۔ تب ہاجرہؑ نے کہا۔ جاؤ! وہ اللہ تعالیٰ ہم کو ضائع نہیں کرے گا۔ آخر پیاس کی شدت میں پانی تلاش کرتے ہوئے جب یہاں دوڑیں تو خدا نے زم زم سے ان کی مدد کی۔ اس قسم کی یادگاریں اولادِ ابراہیمؑ میں مُروّج تھیں۔

پھر عرفات کے میدان میں جانا مناسکِ حج میں ایک ضروری عمل تھا جہاں نہ کوئی پتھر نہ کوئی درخت۔ صرف یادِ الٰہی ہے اور اسی سے دُعا۔

غرض حج عمل ہی عمل اور مسلسل عمل ہی کا دوسرا نام ہے کوئی رسمی تہوار نہیں جسے محض دن کی حیثیت سے منایا جائے۔

اسرارِ حج از شاہ ولی اللہؒ

حکیم الاُمت حضرت مولانا شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" کے پہلے حصہ میں "اسرارِ حج" کے زیرِ عنوان حج کے متعلق جو چند الفاظ لکھے ہیں ان کا مطالعہ یہاں فائدہ سے خالی نہیں۔ آپ لکھتے ہیں:۔

"واضح ہو کہ حج کی حقیقت یہ ہے کہ صالحین کی ایک بڑی جماعت ایک وقتِ خاص میں جمع ہو کر انبیاء اور صدیقین، شہداء اور صالحین کے حالات کو جن پر خدا نے اپنا انعام کیا ہے یاد کرے اور ایسی جگہ میں جمع ہوں جہاں خدا کی ظاہر نشانیاں موجود ہوں۔ ائمۂ دین کی بڑی بڑی جماعتیں حج کے لیے گئی ہیں جن کا مقصود خدا کے شعائر کی تعظیم، خاکساری اور رغبت خدا سے گناہوں کی معافی اور خیر کی امید تھی۔ جب اس کیفیت سے لوگوں کی ہمتیں جمع ہوتی ہیں، تو لازمی طور پر خدا کی رحمت اور مغفرت ان پر نازل ہوتی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا یہی مطلب ہے کہ — "شیطان جیسا کہ عرفہ کے روز نہایت ذلیل، صغیر اور حقیر اور رنج میں نظر آتا ہے ایسا کسی روز نظر نہیں آتا۔"

"حج کی اصل ہر قوم میں موجود ہے۔ کیونکہ ہر قوم کے لیے ایک ایسی جگہ ضرور ہوتی ہے جس میں خدا کی آیاتِ ظاہرہ دیکھ کر لوگ اس کو متبرک سمجھتے ہیں۔ اور ہر امت میں نذر و قربانی اور ایک ہیئت خاص بھی ہے جو ان کے بزرگوں سے چلی آتی ہے اور وہ اس کا التزام بھی کرتے ہیں کیونکہ یہ ہیئت (احرام و تلبیہ اور ہدی وغیرہ) مقربین کو ان کا وہ کام جس میں وہ لگے ہوئے ہیں ہر وقت یاد دلاتی رہتی ہے اور بیت اللہ ہی حج کرنے کے

قابل ہے۔ اس میں آیاتِ بیّنات ہیں، اس کو خدا کے حکم اور وحی سے صاف اور پاک زمین میں حضرت ابراہیمؑ نے بنایا ہے۔ اس کی مدح اکثر اقوام کی زبان پر چلی آتی ہے۔ کیونکہ سوائے اس جگہ کے اور کوئی ایسی جگہ جہاں لوگ جاتے ہیں، شرک سے یا بے اصل من گھڑت چیزوں سے خالی ہیں۔ طہارات نفسانی میں سے یہ بھی ہے کہ ایسی جگہ رہنا اور ٹھہرنا اختیار کیا جائے جس کی صلحاء ہمیشہ تعظیم کرتے رہے ہوں۔ ذکرِ الٰہی سے اس کو معمور رکھا ہو کیونکہ اس مقام پر ملائکہ ارضیہ کی توجہات مبذول ہوتی ہیں اور اہلِ خیر کے حق میں ملاء اعلیٰ سے دعا نازل ہوتی رہتی ہے۔ پس جب کوئی شخص اس جگہ پر ٹھہرتا ہے تو اس کے رنگ اس پر غالب آجاتے ہیں۔ میں نے اس کا بارہا مشاہدہ کیا ہے۔

ذکرِ الٰہی کی قسم میں خدا کے نشانات کا اور ان کی تعظیم کرنا بھی داخل ہے پس ان چیزوں کے دیکھنے سے خدا اس طرح یاد آتا ہے جیسے ملزوم کے دیکھنے سے کوئی لازم چیز یاد آتی ہے۔ بالخصوص ایسے وقت جب کہ تعظیمی حالتوں اور ان حدود کی پابندی کی جائے جن سے نفس کو کمال درجہ تنبیہ حاصل ہوتی ہے۔

کبھی انسان کو اپنے پروردگار سے دیدار کا شوق ہوتا ہے پس اس شوق کو پورا کرنے والی حج کے سوا اور کوئی چیز نہیں جس طرح پر سلطنت کو ایک مدت کے بعد دربارِ عام لگانے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ سرکش اور فرماں بردار میں تمیز ہو۔ بادشاہت کی شہرت اور سلطنت کا بول بالا ہو اور اس کو ہر شخص جان جائے۔ ایسے ہی مذہب کو حج کی ضرورت ہے تاکہ موافق اور مخالف میں فرق ظاہر ہوجائے۔ اور دینِ الٰہی میں لوگوں کا گروہ در گروہ ہو کر داخل ہونا عیاں ہوجائے اور تاکہ ایک دوسرے سے مل کر ان

فوائد کو حاصل کرے جو اس کو حاصل نہیں ہیں۔ اس لیے کہ باہمی مقاصد ایک دوسرے سے ملنے ہی سے حاصل ہوتے ہیں۔ رسمی حج بھی بہت سے رسمی فوائد کا اضافہ کرتا ہے۔ ائمۂ دین کی حالت یاد کرنے اور اس کا پابند ہونے میں حج سے زیادہ کوئی چیز مفید نہیں ہے۔

چونکہ حج میں دور دراز سفر طے کرنا پڑتا ہے اور نہایت دشوار عمل ہے جو بغیر مشقت کے پورا نہیں ہوتا، اس لیے اس کا ادا کرنا خالص اللہ کی عبادت ہے۔ جس سے خطائیں معاف ہوتی ہیں۔ وہ پہلے گناہوں کو ایسا دور کرتا ہے جیسا کہ ایمان۔" (حجۃ اللہ البالغہ)

عبارتِ بالا سے جسے "حج کے اسرار" کا نام دیا گیا ہے صاف ظاہر اور اس کے ایک ایک فقرہ سے یہ حقیقت کھل کھل کر سامنے آتی ہے کہ حج کے دنوں کی خیر و برکت اور حج کے مقام کی زیارت کا اصل راز صلحاء کے صالح اعمال ہی ہیں جو یاد کے قابل ہیں اور جن کی یاد دلوں میں نیکی کا ایک نیا ولولہ اور جوش پیدا کر دیتی ہے۔

ایک وقیع شہادت مسئلہ سعد و نحس پر

حافظ ابن قیم رح اپنی مشہور کتاب "زاد المعاد فی ہدی خیر العباد" میں بعض دنوں اور راتوں کی فضیلت کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "عشرۂ ذی الحجہ افضل ہے یا ماہِ رمضان کا عشرۂ آخر؟ ....."

"اس سلسلہ میں صحیح بات یہ ہے کہ ماہ رمضان کے آخری عشرہ کی راتیں ذی الحجہ کے عشرہ کی راتوں سے افضل ہیں اور عشرۂ ذی الحجہ کے دن رمضان کی آخری دس راتوں سے افضل ہیں۔"

اس پر دلیل یہ ہے کہ رمضان کی راتیں لیلۃ القدر کی وجہ سے افضل ہیں کیونکہ وہ ان

راتوں میں ایک رات ہے اور عشرۂ ذی الحجہ اپنے دنوں کے اعتبار سے فضیلت دیا گیا ہے کیونکہ اس میں یوم النحر ہے۔ یوم عرفہ ہے اور یوم ترویہ ہے۔ ....

اس سے صاف ظاہر ہوا کہ فضیلت کا اصل سبب اعمال صالح ہیں اور بس۔ (زاد المعاد ص ۱۰-۱۱)

نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم کا حج

دین کے سلسلے میں ہمارے لیے آخری سند نبی آخر الزمان خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اور ارشاد ہے۔ چنانچہ آنحضرت ؐ کا حج اور آخری حج اس ساری بحث کو ختم کر دیتا ہے کہ کسی دن کو صرف دن کی حیثیت سے مانا گیا ہے یا کسی عملی پروگرام کی صورت میں؟ وزن عمل کو دیا گیا ہے یا محض دن کو؟ عمل نے کسی دن کو یادگار ہونے کا مقام بخشا ہے یا کسی دن کی برکت نے عمل کو نیک و بد ہونے کا امتیاز دیا ہے؟

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری حج اور اس دن دیے جانے والے احکام اور انجام دیے جانے والے عوامل پر غور کرو۔

۱۰ سنہ ہجری

اس سال نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کا ارادہ کیا اور تمام اطراف میں اطلاع بھیج دی گئی کہ نبی کریمؐ حج کے لیے تشریف لے جانے والے ہیں۔ اس اطلاع کے بعد انبوہ در انبوہ خلقت مدینہ طیبہ میں جمع ہو گئی۔ اس انبوہ میں ہر درجہ اور ہر طبقہ کے اشخاص تھے۔

ذی الحلیفہ میں نبی صلعم نے احرام باندھا اور یہیں سے لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ کا ترانہ بلند کیا اور مکہ معظمہ کو احرام کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

اس مقدس کاروان کے ساتھ راستہ میں ہر ہر جگہ سے فوج در فوج لوگ شامل ہوتے جاتے تھے۔ نبی کریم صلعم کا راہ میں جب کسی ٹیلہ یا کرپوہ سے گزر ہوتا تھا تین تین بار تکبیر باآواز بلند فرماتے تھے۔

جب مکّہ کے قریب پہنچے تو ذی طویٰ میں تھوڑی دیر کے لیے ٹھہرے اور پھر بالائے مکّہ سے ان سب قوموں اور انبوہ کو لے کر مکہ میں داخل ہوتے۔ اور روز روشن میں کعبۃ اللہ کا طواف کر کے اللہ تعالیٰ کے جلال کو آشکار فرمایا۔

زیارتِ کعبۃ اللہ سے فارغ ہو کر صفا اور مروہ کے پہاڑوں پر تشریف لے گئے ان کی چوٹیوں پر چڑھ کر اور کعبہ کی جانب رُخ کر کے کلماتِ توحید و تکبیر پڑھے اور لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شیء قدیر لا الہ الا اللہ وحدہ انجز وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ کے ترانے گائے۔

آٹھویں ذی الحجہ کو قیام گاہ مکہ سے روانہ ہو کر منیٰ میں ٹھہرے۔ ظہر، عصر، مغرب، عشاء، اور صبح کی نمازیں منیٰ میں ادا فرمائیں۔

نویں ذی الحجہ کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم طلوعِ آفتاب کے بعد وادیٔ نمرہ میں آکر اُترے۔ اس وادی کے ایک جانب مزدلفہ ہے۔ دن ڈھلنے کے بعد یہاں سے روانہ ہو کر عرفات میں تشریف لاتے۔ تمام میدان سر تا سر لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس وقت ایک لاکھ چوالیس ہزار (یا باتیس ہزار) کا مجمع احکام الٰہی کی تعمیل کے لیے ہمہ تن حاضر تھا۔ نبی صلعم نے پہاڑی پر چڑھ کر اور قصواء (اونٹنی) پر سوار ہو کر خطبہ کا آغاز فرمایا:

خُطبہ یومِ حَجّۃُ الوِداع

(۱) یا ایھا الناس! انی لا

۱۔ لوگو! میں خیال کرتا ہوں کہ میں اور

ارانی وایاکم نجتمع فی هذه المجلس ابداً۔

تم پھر کبھی اس مجلس میں اکٹھے نہیں ہوں گے۔

٢- ان دماءکم واموالکم و اعراضکم حرام علیکم کحرمة یومکم هذا فی بلدکم هذا فی شهرکم هذا وستلقون ربکم فیسئلکم عن اعمالکم الا فترجعوا بعدی ضلالا یضرب بعضکم رقاب بعض۔

٢- لوگو! تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزتیں ایک دوسرے پر ایسی ہی حرام ہیں، جیسا کہ تم آج کے دن کی، اس شہر کی اور اس مہینے کی حرمت کرتے ہو۔ لوگو! تمہیں عنقریب خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی بابت سوال فرمائے گا۔ خبردار میرے بعد گمراہ نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو۔

٣- الا کل شیء من امر الجاهلیة تحت قدمی موضوع

٣- لوگو! جاہلیت کی ہر ایک بات میں اپنے قدموں کے نیچے پامال کرتا ہوں۔

ودماء الجاهلیة موضوعة وان اول دم اضع من دماءنا دم ابن ربیعة بن الحارث کان مسترضعا فی بنی سعد فقتله هذیل

جاہلیت کے قتلوں کے تمام جھگڑے ملیا میٹ کرتا ہوں۔ پہلا خون جو میرے خاندان کا ہے یعنی ابن ربیعہ بن الحارث کا خون جو بنی سعد میں دودھ پیتا تھا اور ہذیل نے اسے مار ڈالا تھا، میں چھوڑتا ہوں۔

وربا الجاهلية موضوعة واول ربوا عباس بن عبد المطلب فانه موضوع كله ـ

جاہلیت کے زمانے کا سود ملیامیٹ کر دیا گیا۔ پہلا سود اپنے خاندان کا جو میں مٹاتا ہوں وہ عباس بن عبد المطلب کا سود ہے۔ وہ سارے کا سارا چھوڑ دیا گیا۔

۴۔ فاتقوا الله فی النساء فانكم اخذتموهن بامان الله واستحللتم فروجهن بكلمة الله ولكم عليهن الا يوطئن فروشكم احدا تكرهونه فان فعلن ذلك فاضربوهن ضربًا غير مبرّح

ولهن عليكم رزقهن وكسوتهن بالمعروف

۴۔ لوگو! اپنی بیویوں کے متعلق اللہ سے ڈرتے رہو۔ خدا کے نام کی ذمہ داری سے تم نے ان کو بیوی بنایا اور خدا کے کلام سے تم نے ان کا جسم اپنے لیے حلال بنایا ہے تمہارا حق عورتوں پر اتنا ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی غیر کو (کہ اس کا آنا تم کو ناگوار ہے) نہ آنے دیں لیکن اگر وہ ایسا کریں تو ان کو ایسی) مار مارو جو نمودار نہ ہو۔

عورتوں کا حق تم پر یہ ہے کہ تم ان کو اچھی طرح کھلاؤ، اچھی طرح پہناؤ۔

۵۔ وقد تركت فيكم ما لم تضلوا بعده ان اعتصمتم به كتاب الله ـ

۵۔ لوگو! میں تم میں وہ چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر اسے مضبوطی سے پکڑ لو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے، وہ قرآن

اللہ کی کتاب ہے۔

۶- ایها الناس لا نبی بعدی ولا امة بعدکم الا فاعبدوا ربکم وصلوا خمسکم وصوموا شهرکم وادوا زکوة اموالکم طیبة لها انفسکم وتحجون بیت ربکم واطیعوا ولات امرکم تدخلوا جنة ربکم

۶- لوگو! نہ تو میرے بعد کوئی پیغمبر ہے اور نہ کوئی جدید امت پیدا ہونے والی ہے۔ خوب سن لو کہ اپنے پروردگار کی عبادت کرو اور پنج گانہ نماز ادا کرو۔ سال بھر میں ایک مہینہ رمضان کے روزے رکھو مالوں کی زکوٰۃ نہایت دل خوشی کے ساتھ دیا کرو۔ خانۂ خدا کا حج بجا لاؤ۔ اور اپنے اولیائے امور اور حکّام کی اطاعت کرو جس کی جزا یہ ہے کہ تم کو پروردگار فردوس بریں میں داخل کریگا۔

۷- وانتم تسئلون عنی فما انتم قائلون ؟

۷- لوگو! قیامت کے دن تم سے میری بابت بھی دریافت کیا جائیگا مجھے ذرا بتادو کہ تم کیا جواب دوگے؟

قالوا نشهد انك

سب نے کہا ہم اس کی شہادت دیتے ہیں کہ:

قد بلغت

آپ نے اللہ کے احکام ہم کو پہنچادئے۔

وادیت

آپ نے رسالت اور نبوت کا حق ادا کر دیا۔

ونصحت

آپ نے ہم کو کھوٹے کھرے کی

بابت اچھی طرح بتا دیا۔

فقال باصبعه السبابة یرفعها الی السماء وینکتها الی الناس

(اس وقت) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگشتِ شہادت کو اٹھایا۔ آسمان کی طرف انگلی کو اٹھاتے تھے اور پھر لوگوں کی طرف جھکاتے تھے۔

اللهم اشهد

(فرماتے تھے) اے خدا سن لے (تیرے بندے کیا کہہ رہے ہیں)

اللهم اشهد

اے خدا گواہ رہنا (کہ یہ لوگ کیا گواہی دے رہے ہیں)

اللهم اشهد

ثلاث مرات

اے خدا شاہد رہ (کہ یہ کیسا صاف اقرار کر رہے ہیں۔)

۸۔ الا لیبلغ الشاهد الغائب فلعل بعض من یبلغه ان یکون ادعیٰ له من بعض من سمعه

۸۔ دیکھو! جو لوگ موجود ہیں وہ ان لوگوں کو، جو موجود نہیں ہیں اس کی تبلیغ کرتے رہیں۔ ممکن ہے کہ بعض سامعین سے وہ لوگ زیادہ تر اس کلام کو یاد رکھنے اور حفاظت کرنے والے ہوں جن پر تبلیغ کی جائے۔

(عن ابی بکرہ۔ صحیح بخاری۔ باب حجۃ الوداع)

اثرات

۱۔ ناظرین اس خطبۂ نبوی کو پڑھیں۔ غور سے پڑھیں۔ ذرا تفکر و تدبر سے پڑھیں کہ

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے کیوں کر اپنے الوداعی خطبہ میں قرآن مجید پر عمل کرنے کی تاکید فرمائی ہے اور کیونکہ قرآن مجید پر عمل کرنے والے کے لیے یہ حتمی وعدہ کیا ہے کہ وہ کبھی گمراہ نہ ہوگا۔

۲۔ کیونکہ مسلمانوں کے باہمی حقوق جان و مال اور عزت کو محفوظ فرمایا ہے۔

۳۔ کیونکہ بیویوں کے حقوق پر نہایت مستحکم الفاظ میں توجہ دلائی ہے۔

۴۔ کیونکہ اپنی ذات مبارک کے متعلق اپنے عمر بھر کے کارناموں کے متعلق ہمارے باپ دادوں سے گویا مہریں ثبت کرالی ہیں۔

۵۔ کیونکہ ہر ایک مسلمان کو تبلیغ اور اشاعت اسلام کا ذمہ دار اور جواب دہ قرار دیا ہے۔

یہی ہیں وہ اصول اور احکام جن پر عمل کرنا مسلمانوں کو دنیا اور دین میں سر بلند کر سکتا ہے اور جن کا ترکِ عمل انہیں خسر الدنیا و الآخرۃ کا مصداق بناتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ سے فارغ ہوئے تو اسی جگہ اس آیت کا نزول ہوا۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط (آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا اور میں نے تمہارے لیے اسلام کا دین ہونا پسند فرمایا ہے)۔

یوم النحر کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶۳ شتر اپنے ہاتھ سے اور ۳۷ شتر حضرت علی رضؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ذبح کیے۔ یہ قربانی منیٰ پر کی گئی تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے قربان گاہ چلی آتی تھی۔ قربانی سے فارغ ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ میں آئے اور طواف کا اضافہ ادا کیا۔ قربانی اور طواف میں سب نے آنحضرت صلعم کی اقتدا کی۔ ہزاروں اونٹ، مینڈھے، بکرے اور بھیڑیں قربانی کی گئیں۔

حج سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود شعائر اللہ کی تعظیم، حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے سُنَنِ ہُدیٰ کا احیا، اور کفار کے مشرکانہ رسوم کا ابطال، توحید خالص کا اعلان، تعلیم اسلام کی اشاعتِ عامہ تھا چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو اس حج میں آخری تبلیغ فرمائی تھی اس لیے اس حج کا نام حجۃ البلاغ بھی ہے اور چونکہ اس حج میں آنحضرت صلعم نے امت سے کلمات تودیع فرمائے تھے اس لیے اس کا نام حجۃ الوداع بھی ہے۔

غرض نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم اس کامیابی کے ساتھ ایک لاکھ چوالیس ہزار برگزیدہ بندوں کے سامنے توحید کی تعلیم و عمل اور البلاغ و الوداع کے بعد مسرور و مُبتہج مدینہ طیبہ کو روانہ ہوئے۔ (اقتباس از رحمۃ للعالمین)

یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حج کی مختصر روئداد ہے جو آپ نے عمر کے آخری حصہ میں کیا ہے۔ اس واقعہ کے ایک ایک موقعہ پر غور کرو کس قدر مربوط عملی پروگرام ہے جو مسلسل چل رہا ہے۔ عمل ہی عمل ہے جو ماضی پر بھی چھایا ہُوا ہے، حال پر بھی اور مستقبل پر بھی اور سب سے بڑھ کر اس کھلی حقیقت پر غور کرو کہ ساری قوم کے معمول بہ سن و سال کے بارہ مہینوں میں اس مہینہ کا نام ہی "ذی الحجہ" ہے یعنی وہ مہینہ جس میں حج ہوتا ہے۔ گویا عملِ حج کے نام پر ہی مہینہ کا نام رکھا گیا ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے۔ کہ عمل مقدم ہے اور وقت کی تعیین بعد۔ عمل ہی وقت کا خالق ہے اس لیے اصل چیز عمل ہی عمل ہے۔
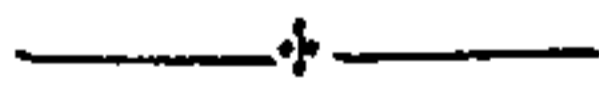
یوم عاشورا

یوم عاشورا بھی ان تقریبات میں سے ایک تقریب ہے جو آجکل کے مسلمان معاشرے کے ایک طبقہ میں مُروّج ہے اور خصوصیت کے ساتھ ماتمی غم واندوہ کی صورت میں منائی جاتی ہے۔ اس ماتم کی بنیاد حضرت امام حسین رضؓ کی شہادت ہے۔

حضرت امام حسین رضؓ کی شہادت کے دن کو ایک تقریب کی صورت میں منانے کے لیے اس کے اسباب وموجبات کے پیش نظر کئی سوالات سامنے آتے ہیں:۔

۱۔ کیا اس موقع پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کوئی عمل یا قول موجود پایا جاتا ہے جس کی پیروی اور تتبع میں اس دن کو حضور اکرمؐ کے طریقہ کے مطابق مناکر ادائے سنت کا ثواب حاصل کیا جائے؟ اور ان آداب ورسوم کی پاس داری کی جائے جو طرزِ عمل حضورؐ نے اس موقع پر ملحوظ رکھا؟

چونکہ یہ واقعہ ۶۱ھ ہجری محرم الحرام کی دسویں تاریخ وقوع میں آیا اور حضور اکرمؐ اس سے پچاس سال پہلے ہی ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ یوم دوشنبہ وصال پاچکے تھے، اس لیے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس موقعہ پر حضورؐ کے اسوۂ حسنہ سے براہِ راست استدلال اور استشہاد حاصل کیا جائے۔

البتہ اس سلسلے میں حضورؐ کا طرزِ عمل، اکثر صحابۂ کرام رضؓ کی مقدس ہستیوں کے ایام شہادت کے مواقع پر جو مختلف دنوں اور تاریخوں میں آپ کی زندگی میں شہید ہوئے بڑی وضاحت سے نظر آتا ہے۔ وہاں کسی ایک صحابی کی شہادت کے دن کو ماتمی رسوم وآداب

کی صورت میں ایک مستقل تقریب قرار دے کر منانا نہ خود حضور م کے کسی قول و عمل سے ثابت ہوتا ہے نہ کسی صحابی سے۔ بلکہ لاکھوں کی تعداد میں صحابہؓ کرام کی مقدس جماعت میں سے کسی ایک نے بھی کوئی ایسی تقریب نہیں منائی۔ یہاں تک کہ خود رسول اللہ صلعم کی وفات کے عظیم حادثہ کے دن کو بھی مُحبّانِ رسول م کی اس پاک جماعت میں سے کسی نے ماتمی تقریب کی صورت میں نہیں منایا۔ حالانکہ صحابیوں کے سامنے کئی صحابی شہید ہوئے اور تمام کے سامنے خدا کا آخری رسول خدا کا آخری پیغام دے کر دنیا سے رخصت ہوا۔

اس سلسلہ میں ایک عورت مائی صفیہ صحابیہ رض کے طرزِ عمل کا حوالہ کافی ہو سکتا ہے۔ ماتم کے معاملہ میں عورتوں سے بڑھ کر کوئی نرم دل نہیں ہو سکتا۔ جنگِ اُحد میں اکابرِ صحابہ میں سے حضور اکرم م کے عم بزرگوار حضور م کے نہایت پیارے صحابی حضرت حمزہ رض شہید ہوتے ہیں اور دشمنوں نے ان کی لاش کو بھی ناک کان کاٹ کر اور پیٹ چاک کر کے بگاڑ دیا تھا۔ جنگ کے بعد زبیر رض کی والدہ سید الشہدا حضرت حمزہ رض کی بہن صفیہ رض میدانِ جنگ میں پہنچتی ہیں۔ زبیر رض نے اپنی ماں کو دور ہی سے روکا۔ صفیہ رض نے کہا "مجھے معلوم ہے کہ میرے بھائی کی لاش بگاڑی گئی ہے اور بے حرمت کی گئی ہے لیکن یہ تو ہمارے لیے فخر کا مقام ہے۔ بیٹا! میں نہ روؤں گی نہ چلاؤں گی۔ صرف دعا پڑھ کر لوٹ جاؤں گی۔" یہ ایک عورت کا حال ہے اور حمزہ رض جیسے اپنے بھائی کی شہادت کے موقع پر۔ شہید کے ماتم کے سلسلہ میں یہ ہے ایک صحابیہ رض کا اُسوہ۔

جنگ کے بعد جب حضور اکرم م گھر تشریف لاتے تو شہر کی عورتوں کا ہجوم حضرت حمزہ رض کا ماتم کرتے ہوئے دیکھا۔ آپ نے سب کو اپنے اپنے گھروں کو واپس کرا دیا۔ یہ اسوۂ رسول ہے!

۲۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جہاں اس جاں فروشی پر جنت کا وعدہ کیا ہے۔ ذرا اس بشارت کا ردِ عمل ملاحظہ کرو:۔

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ — بے شک اللہ نے مسلمانوں سے

اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ط يُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ قف وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ ط وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِكُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِهٖ ط وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝

ان کی جانوں اور مالوں کو اس قیمت پر خرید لیا کہ ان کے لیے جنت ہے، یہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں پھر قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں۔ تورات، انجیل اور قرآن میں اللہ کے ذمے سچا وعدہ ہو چکا اور اللہ سے بڑھ کر قول کا پورا کون ہے؟ تو اس بیع پر خوشیاں مناؤ جس کا معاملہ تم نے اللہ سے کیا ہے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ (سورۂ توبہ۔ رکوع ۱۴)

جابر بن عبداللہ رضؓ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو تمام موجودہ لوگوں نے مسجد میں زور سے تکبیر کہی۔ اتنے میں ایک انصاری مسجد میں آیا اور اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا یہ آیت آپ پر نازل ہوئی ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ اس کی زبان سے بلا تامل یہ الفاظ نکلے: بیع ربیح لا نقیل ولا نستقیل "یہ سودا تو بڑا ہی سودمند ہے، ہم اسے ہرگز واپس نہیں کریں گے۔"

۳۔ اللہ تعالیٰ نے اسرائیلی یہودیوں کو جنہیں خدا کے چہیتے اور پیارا ہونے کے سلسلہ میں اس قدر بلند بانگ دعوے تھے کہ خود کو خدا کے بیٹے یقین کرتے تھے۔ (نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ) حکم دیا۔

قُلْ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝

(اے پیغمبر! ان یہودیوں سے کہو کہ اے یہود! اگر تم کو اس بات کا گھمنڈ ہے کہ اور تمام آدمیوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے چہیتے ہو اور (اپنے اس دعوے میں) سچے (بھی) ہو تو موت کی تمنا کرو!)

(سورۂ جمعہ)

یعنی خدا کی راہ میں موت کی آرزو اللہ کا دوست ولی اللہ ہونے کی علامت ہے اور وعدہ جنت پر یقین کا نشان ہے۔ اسی لیے فرمایا:۔

وَلَا یَتَمَنَّوْنَہٗ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْہِمْ ط — مگر یہ لوگ ان (اعمالِ بد) کے ڈر سے جن کے مرتکب ہو چکے ہیں کبھی موت کی تمنا کرنے والے نہیں۔

(سورۂ جمعہ)

۴۔ اس کے مقابلے میں سچے مومنوں کی حالت یہ ہے کہ خدا کی راہ میں نہ نکل سکنے پر غم کے آنسو بہاتے ہیں۔

(سورۂ توبہ رکوع ۱۸ میں ہے۔ جب رسول اکرم ص، اللہ اور رسول کے دلی وفادار و محسنین میں سے کمزور، بیمار اور بے استطاعت لوگوں کو جہاد سے مستثنےٰ فرماتے ہیں تو ان مومنوں کی حالت دیکھو جو مایوس ہو کر دربارِ نبوی سے لوٹتے ہیں۔

"اور نہ ان لوگوں پر کسی طرح کا الزام ہے کہ جس وقت وہ تمہارے پاس (درخواست لے کر) آئے۔ کہ تم ان کے لیے سواری بہم پہنچا دو تو تم نے (ان کو) جواب دیا کہ میرے پاس تو کوئی (سواری) موجود نہیں کہ تم کو اس پر سوار کروں (یہ سن کر وہ لوگ اپنی جگہ) لوٹ گئے اور خرچ میسر نہ آنے کے غم کے مارے اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے"

شہیدوں کی شہادت پر رونا کہاں اور شہادت کا شوق پورا نہ ہو سکنے کے غم میں رونا کیا؟ ع بہیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا؟

غرض شوقِ شہادت کے سلسلہ میں کسی دوسرے کی بات کیا ہے۔ خود سیّد ولد آدم خیر البشر حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس جذبات کا اندازہ کرو! آپ فرماتے ہیں:

لوددت انی اقتل فی سبیل اللہ ثم احي ثم اقتل ثم احي ثم	میں چاہتا ہوں کہ خدا کی راہ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل

اقتل ثم احیی حتی سبعین مرۃ۔ — کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں، یہاں تک کہ ستر (۷۰) مرتبہ ایسا ہی ہو۔

وہ مزا دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب!
مرے دونوں پہلوؤں میں دلِ بے قرار ہوتا

اس کے برعکس منافق جب جہاد کا نام سنتے اور میدانِ جنگ میں جانے کے لیے مجبور ہوتے تو انہیں موت دکھائی دیتی۔ قرآن کریم کی شہادت سنیئے۔ فرمایا:

كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ — گویا کہ وہ موت کے منہ میں دھکیلے جا رہے ہیں۔

شہدا کے متعلق قرآن کریم میں جو لفظ بہ تکرار آئے ہیں۔ عام سے عام لوگ ان سے واقف ہیں۔ فرمایا ہے:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِھِمْ مِّنْ خَلْفِھِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں انہیں مُردہ نہ سمجھو وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں، جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اس پر خوش و خرم ہیں اور مطمئن ہیں کہ جو اہلِ ایمان ان کے پیچھے دنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ان کے لیے بھی کسی خوف اور رنج کا موقعہ نہیں۔ وہ اللہ کے انعام اور اس کے فضل پر شاداں و فرحاں ہیں اور ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ (آلِ عمران : ۱۷۱)

(ا) پہلی بات کہ خدا کی راہ میں کام آنے والے شہیدوں کو خیال بھی نہ کرو کہ وہ مر مٹ گئے ہیں بلکہ انہوں نے ایک ابدی زندگی حاصل کر لی ہے اور اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں۔

(ب) خدا نے جو کچھ انہیں اپنے فضل و کرم سے عطا فرمایا ہے اس پر وہ خوشیاں منا رہے ہیں۔ بلکہ اپنے ان متعلقین ایمان داروں کی نسبت بھی مطمئن اور خوش ہیں کہ وہ بھی ہماری طرح شہید ہو کر ہم سے آملیں تو انہیں بھی بے خوف و خطر اور اطمینان بخش زندگی کی ابدی راحتیں نصیب ہوں۔

غرض شہید اپنی جگہ پر اپنی فانی زندگی کے بجائے ابدی زندگی اور اس ابدی زندگی کی پائدار نعمتوں اور راحتوں پر خوش ہیں بلکہ اپنے پیچھے رہ جانے والے مومنوں کے حق میں بھی انہیں نعمتوں کے متوقع ہیں اور خدا ان پر راضی ہے ـــــ آخر وہ لوگ کون ہیں جو شہادت کو موت کا دن منا کر شہیدوں کی روحوں کو خوش کرنا چاہتے ہیں؟ شہید تو بقول قرآن کریم اپنے سچے خیرخواہوں اور ساتھیوں کے لیے اپنی جیسی مبارک موت کی آرزوں کی خوشیاں منا رہے ہیں اور ان کے یہ ہمدرد اور ہوا خواہ ماتم منا منا کر ان کی عیش کو منغص کر رہے ہیں۔

(مسند احمد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مشہور حدیث درج ہے جس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ جو شخص نیک عمل لے کر جاتا ہے اسے اللہ کے ہاں اس قدر پر لطف اور پر کیف زندگی حاصل ہوتی ہے جس کے بعد وہ کبھی دنیا میں واپس آنے کی آرزو نہیں کرتا مگر شہید اس سے مستثنیٰ ہے۔ وہ تمنا کرتا ہے کہ پھر دنیا میں بھیجا جائے اور پھر اس لذت اور اس سرور سے لطف اندوز ہو جو مومن کو راہِ خدا میں جان دیتے وقت حاصل ہوتا ہے؟)

۲۔ جہاں تک یوم عاشورا کے متعلق روایات کا تعلق ہے۔ اکثر بزرگوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح کی مشہور کتاب "غنیۃ الطالبین" کی چند سطور

اس سلسلہ میں ملاحظہ ہوں: آپ ایک روایت میں حضرت ابن عباس رض کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم عاشورا کے فضائل بیان فرمائے تو حضرت عمر رض نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ نے واقعی عاشورا کے دن میں ہمیں بڑی فضیلت دی ہے" حضور اکرم ع نے فرمایا: خدا نے زمین و آسمان کو یوم عاشورا کے دن میں پیدا کیا زمین کے پہاڑوں اور آسمان کے ستاروں کو، عرش اور کرسی کو، لوح اور قلم کو، جبریل اور سب فرشتوں کو، آدم ع کو، ابراہیم ع کو اسی دن میں پیدا کیا، حضرت اسمٰعیل ع کا فدیہ اسی دن میں واقع ہوا۔ فرعون کا غرق ہونا، حضرت ادریس ع کا رفع سما، حضرت ایوب ع کا بیماری سے شفا پانا، حضرت عیسیٰ ع کا آسمان کی طرف اٹھا لے جانا، حضرت عیسےٰ ع کی ولادت، حضرت آدم ع کی توبہ کا قبول ہونا، حضرت داؤد ع کے گناہ کی معافی، حضرت سلیمان ع کی تخت نشینی، خود اللہ تعالیٰ کا عرش پر متمکن ہونا، قیامت کا برپا ہونا اور زمین پر پہلی بارش برسنا یہ سب کچھ یوم عاشورا میں ہوا ہے۔

انسان کی عملی زندگی سے متعلق ابتدائے آفرینش سے لے کر قیامت تک کے بڑے بڑے مذکورہ انقلابی واقعات کے علاوہ یہ ایک واقعہ اسلام کی تاریخ میں بھی نظر آتا ہے:

۷۔ تعزیت کا قرآنی طریقہ

اس سارے سلسلہ میں سب سے بڑی اور اہم بات یہ ہے کہ شہدائے احد کے ورثا میں بار نیت یہود مدینہ نے جو بددل کرنے والا شر انگیز پراپیگنڈا شروع کر رکھا تھا اور اس واقعہ کو ماتم کا رنگ دے دے کر مسلمانوں کو پریشان کرنے کی سعی نامسعود جاری کر رکھی تھی، اللہ تعالیٰ نے آل عمران کی محولہ بالا آیات میں اپنے پیارے مومنوں کے سامنے اپنے دوست شہدائے کرام کی ماتم پرسی اور تعزیت کا وہ سچا، صحیح اور حکیمانہ فطری طریقہ پیش کیا ہے جو ایسے واقعات پر سچے مومنوں کے لیے ہمیشہ ہمیشہ وجہ صد اطمینان اور اس فانی زندگی کا دستور العمل رہنا تھا۔

(خدا کے بتلائے ہوئے طریقہ سے بڑھ کر ایک مومن کے لیے کسی معاملہ میں اور کونسا طریقہ بہتر، سودمند اور تسلی بخش ہو سکتا ہے؟ آیت کے کھلے کھلے صاف مفہوم پر بار بار غور کرو!)

"اگر شہید اپنی شہادت کی موت پر خوش ہیں حتیٰ کہ اپنے عزیز و اقارب پسماندگان کے لیے بھی ایسی ہی راحت آفرین اور حیات بخش موت کے آرزومند ہیں تو لامحالہ ہم کو اگر ان سے کوئی تعلق ہے تو ہمیں ان کی خوشی سے خوشی ہونی چاہیئے نہ کہ برعکس ان کی خوشی کا ماتم ہو۔ یقیناً خدائے برتر حکیم مطلق کی اس پر حکمت تعزیت پر مومن مطمئن ہو گئے اور قیامت تک مطمئن رہیں گے۔"

رہا زندگی اور موت کا سوال تو یاد رکھو اور اچھی طرح یاد رکھو کہ مسلمان کا موت کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ؎

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

حرفِ آخر

(صحیحین میں مذکور ہے کہ حضور اکرم ؐ جب ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ میں پہنچے تو یہود کو یوم عاشورا کا روزہ رکھتے دیکھا۔ پوچھا۔ یہ کیسا روزہ ہے؟ انہوں نے کہا یہ ایک بہت بڑا باعظمت دن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو اس دن میں فرعون سے نجات دلائی اور موسیٰ ؑ نے شکریے کا روزہ رکھا۔ اور ہم بھی ان کی پیروی میں اس دن کا روزہ رکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا؛

فنحن احق و اولی بموسیٰ منکم — ہم موسیٰ علیہ السلام کے طرز عمل کو
فصامہ و امر بصیامہ — اپنانے کے لیے تم سے زیادہ

حق دار ہیں۔ سو آپ نے خود بھی روزہ رکھا اور صحابہ کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔

اس روایت کی صحت میں کوئی شک نہیں متعدد ذرائع سے اس کی تصدیق ہوتی

ہے۔ فرعون اور اس کے لاؤ لشکر کا غرق ہونا اور بنی اسرائیل کا چار سو سال کی مظلومانہ محکومی کے بعد فرعون ایسے ظالم حکمران کی ذلیل غلامی سے نجات پانا ایک اولوالعزم پیغمبر کی بعثت کی خیر و برکات کا وہ انقلابی واقعہ ہے جسے یاد رکھا جائے اور اس حیثیت سے یاد رکھا جائے کہ خدا کی رحمتوں اور نوازشوں کی یاد مومنوں کے دلوں میں خدا کے شکر کا یہ جذبہ موجزن کر دے، جابر حکومتوں کے سامنے حق گوئی کا ولولہ دلوں میں اُبھرے، باطل کے مُقابلہ کی قوت تازہ ہو اور خدا کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کا سامنا استقامت اور پامردی سے کرنے اور کرتے رہنے کا حوصلہ زندہ رہے تو یہ صورت کسی دن کو ایک خاص دن کی حیثیت سے منانے کی رسم پرستی نہیں، قوت عمل کا احیاء و نمود ہے۔ انسان کو یہ سعادت جس دن میں بھی حاصل ہو وہی دن بابرکت ہے۔ خواہ کوئی دن ہو۔ برکت کا تعلق عمل اور جذبۂ عمل سے ہے۔ نہ کہ کسی دن، کسی تاریخ اور وقت کے کسی خاص حصہ سے

وہ یوم عاشورا جو آج ہمارے معاشرے میں حضرت امام حسین رضؓ کی شہادت کا دن سامنے رکھ کر منایا جاتا ہے۔ اس کا ایک یہ پہلو بھی تو ہے کہ آپ ایک ایسی بڑی حکومت کے مقابلے میں نکلے جو بعض معاملات میں منہاج النبوت کی شاہراہ سے ہٹ چکی تھی۔ چنانچہ آپ نے بمقام بیضہ میں جو مختصر خطبہ دیا اس میں اپنا یہی موقف بیان فرمایا۔ باقی رہا ظاہری کامیابی یا ناکامی کا سوال۔ سو راہ حق میں جان دیتے ہوئے جان دینے والے کے سامنے سرے سے یہ سوال ہی نہیں ہوتا۔ وہ جان تک قربان کر کے بھی اپنے مشن میں کامیاب ہی کامیاب ہے۔

آنانکہ غمِ تو برگزیدند ہمہ ۔۔۔ در کوئے شہادت آرمیدند ہمہ
در معرکۂ دوکون فتح عشق است ۔۔۔ با آنکہ سپاہ او شہید ند ہمہ

(جن لوگوں نے تیرا غم محبت اختیار کر لیا ہے وہ سب کے سب شہادت کے کوچہ میں آرام کر چکے ہیں۔ دونوں جہان کے اندر حق و باطل کے معرکہ میں فتح عشق ہی کا حق ہے باوجود اس کے کہ اس کی سب فوج شہید ہو جائے۔)

عیدین کی تقریب

مُفید اور مُضر پہلو

ہر متمدن ملک اور ہر مہذب قوم کے طرزِ زیست میں یہ دستور بالعموم موجود پایا جاتا ہے کہ سال میں چند ایک دن ایسے منائے جائیں جن میں وہ لوگ معاش کے عام دھندوں سے کچھ وقت فارغ ہو کر اپنی اجتماعی شان و شوکت، مال و دولت اور زیب و زینت کا مظاہرہ کریں۔ ان تقریبات پر ہر قوم اپنی ملکی اور قومی روایات کے مطابق کسی خاص اہم واقعہ کو بنیاد قرار دے کر اجتماع کی ایک صورت پیدا کر لیتے ہیں۔

جس وقت تک کسی قوم میں اجتماعی روح قائم رہتی ہے اور اجتماعیت کے فائدوں کا احساس قوم کے افراد میں موجود ہوتا ہے اس وقت تک تو اس قسم کے اجتماعات میں بھی افادیت کا پہلو غالب رہتا ہے۔ افرادِ قوم اکٹھے ہو کر اپنی قومی زندگی کے اس اہم واقعہ کی یاد کو تازہ کر کے جس یاد کی بنیاد پر کسی اہم عملی مقصد کا رنامے کی وجہ سے یہ دن تقریب کی صورت میں منایا جا رہا ہے، اپنے دلوں میں ایک نیا جوش پیدا کر لیتے ہیں اور قوم کے نیک و بد کو سامنے رکھ کر ہر چھوٹے بڑے کو مشورہ میں شریک کر کے سالِ گزشتہ کے واقعات پر تبصرہ کرتے ہیں اور آنے والے سال کے لئے مفید تجاویز سوچ لیتے ہیں اور اس طرح یہ تہوار ساری قوم میں ایک نئی روح پھونکنے اور نیا جوشِ عمل پیدا کرنے

کا ذریعہ بن جاتا ہے ـــــ لیکن اس کے برعکس جب کسی قوم میں اجتماعی روح ختم ہو جاتی ہے اور خود غرضیوں کی نفسانفسیاں معاشرے میں غالب آجاتی ہیں تو پھر یہی اجتماعات قوم کی اجتماعی شان کو فائدہ پہنچانے کے بجائے انفرادی نمود و نمائش کے اکھاڑے بن جاتے ہیں، اُمراء غریبوں کو رشک دلانے اور طاقت ور کمزوروں کو لتاڑنے اور ان پر اپنی طاقت کا سکہ جمانے کے لیے ان ہی تہواروں کو بہترین مواقع قرار دے لیتے ہیں۔

کسی گزرے ہوئے رہنمائے قوم کے قابلِ ذکر کارنامے کی یاد فراموش ہو جاتی ہے اور یہ دن صرف ایک جشن ہو کر رہ جاتا ہے جس میں تحفے تحائف کا وہی مبادلہ جو ایسی تقریبات پر مساوی حیثیت سے سب لوگوں میں باہمی محبت اور ایک دوسرے کے احترام کا ذریعہ تھا اب وہ دولت مندوں کی طرف سے غریبوں پر شاہانہ داد و دہش اور غریب نوازیوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور نتیجتہً غریب کو امیر کی پرستش پر مجبور کر دیتا ہے اور پھر اس طرزِ معاشرت کا آخر کار یہ انجام یا ردِّ عمل بھی ہوتا ہے کہ اس مجبور پرستار کے دل میں اپنے جابر معبود کے خلاف نفرت کے جذبات پرورش پانے شروع ہو جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ عام معاشرے میں ہر فرد کا احساس عزتِ نفس بھی ابھرنے لگتا ہے چنانچہ یہ معاملہ اس سطح پر پہنچ کر ان اجتماعات کے ساتھ عوام کی دلچسپی اور وابستگی ختم کر دیتا ہے جس سے یہ اجتماعات بالعموم بے رونق ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ لوگ اکٹھے ہوں بھی تو ایک بے مقصد ہجوم کی حیثیت سے اکٹھے ہوتے ہیں جس ہجوم کے افراد تو اکٹھے نظر آتے ہیں لیکن ان کے دل منتشر اور ایک دوسرے سے دور ہوتے ہیں۔ غریبوں کے دل میں امیروں سے نفرت اور بڑے کی نگاہ میں چھوٹا حقیر ہوتا ہے۔ غرض اجتماعی شان و شوکت کے ولولوں کے بجائے انفرادی بے دلی کا ہر فرد شکار ہوتا ہے۔ ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال مرحوم نے اسی کیفیت کی ترجمانی کی ہے:

عید آزاداں شکوہِ مُلک و دیں ۔۔۔ عیدِ محکوماں ہجومِ مومنین

(آزاد قوموں کی عید تو ناک اور دین کے اصل شان و شکوہ کا سبب ہوتی ہے لیکن محکوموں کی عید صرف ہجوم مومنین ہوتی ہے)۔

ان حالات میں قوم کے کھاتے پیتے اور مرفۃ الحال افراد جو ان اجتماعات کو قومی مفادات سے زیادہ ذاتی شان و شکوہ کی نمود و نمائش کا ذریعہ سمجھتے ہیں وہ ان میں دوبارہ دلچسپی پیدا کرنے کے لیے (ان تہواروں کے منانے کے آداب اور طور طریقوں میں کچھ سطحی اور گھٹیا قسم کے مشاغل کا اضافہ کر دیتے ہیں جو عام کھیل تماشوں کے اکھاڑوں سے لے کر راگ رنگ، ناؤ نوش اور منکرات و فواحش کی آخری حدوں تک پہنچ جاتے ہیں۔)

ان اجتماعات کی یہ صورتِ حال وہ ہے جو قریب قریب مختلف قوموں کے ہر قومی تہوار میں پائی جاتی ہے آج بھی اور آج سے پہلے بھی۔

(جن دنوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ میں تشریف لے گئے معلوم ہوا کہ مدینہ کے لوگ سال میں دو دن مناتے تھے جن میں وہ سب کچھ ہوتا تھا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ آپ نے فرمایا: "یہ دن کیسے ہیں؟" لوگوں نے جواب دیا: "ان دنوں میں ہم ایامِ جاہلیت میں کھیلا کودا کرتے تھے۔" آپ نے فرمایا: "خدا نے تم کو ان کے بدلے میں ان سے بہتر دو دن عطا فرمائے ہیں۔ وہ "یوم الاضحیٰ" اور "یوم الفطر" ہے)۔

بعض نے کہا ہے کہ وہ دو دن جو مدینہ میں منائے جاتے تھے نوروز اور مہرجان تھے۔

اب ان دو بہتر دنوں پر غور کرو جو خدا نے نوروز اور مہرجان کے میلوں کے عوض مسلمانوں کو دیے ۔ ان میں یوم الاضحیٰ وہ دن ہے جو موحدِ اعظم ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ علیہما السلام کی بے مثال قربانیوں کی یاد تازہ کرتا ہے جس یاد میں انابت الی اللہ توحید اور فدویت و عبودیت کے انتہائی مخلصانہ اعمال کی یاد کے علاوہ عرب کے لوگ ان قربانیوں کو اپنے جدِ امجد کا قابلِ فخر کارنامہ بھی یقین کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے انہیں اس ایمان افروز تقریب سے فطری طور پر دلچسپی ہو سکتی تھی۔

دوسرا دن عید الفطر ہے جو ماہ رمضان کے روزوں کی با مشقت عبادت سے فارغ ہو کر شکریہ کی صورت میں منایا جاتا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ شارع اسلام علیہ السلام نے اپنے پیرووں کو ان تقریبات کا پتہ دیے کر جن رسوم و آداب کا پابند بنایا ہے ان آداب میں قوم کو اجتماعی شان و شوکت کے مظاہرہ کی اجازت کے ساتھ ساتھ جو آخری اور حقیقی راہ نمائی کی ہے وہ دو رکعت نماز اور وعظ و تذکیر کا عمل ہے۔ کوئی مومن خواہ بڑا ہے یا چھوٹا، دولت مند ہے یا مفلس، عالم ہے یا عامی حاکم ہے یا محکوم، غرض قوم کے اسود و احمر کا ایک ایک فرد جس وقت تک اپنی معطر پیشانی کو زمین پر رکھ کر خوشبودار بالوں کو خاک آلود نہ کر لے اور بارگاہ ایزدی میں سجدہ ریز ہو کر صرف خدا ہی کی برتری اور حاکمیت اعلیٰ کا سچا اعتراف اور باقی ساری کائنات کے عجز و محکومیت کا مساوی حیثیت سے عملی مظاہرہ نہ کر لے اور بنیادی حیثیت سے انسانی عمل اس میں شامل نہ ہو جائے۔ اس تقریب سعید میں شمولیت کے دعوے کا وہم تک بھی دل میں نہیں لا سکتا۔ اور قطعاً نہیں کہہ سکتا کہ میں نے عید منائی ہے۔ گویا عید دوسرے لفظوں میں صرف اور صرف انسان کے عمل خیر دو رکعت نماز کا نام ہے اور فقط۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے روحانی تحریک کو شان و شکوہ کے اظہار کی اس تقریب میں ایسا شامل کیا ہے کہ اس تحریک کو تقریب سے علیحدہ کرنا ممکن ہی نہیں یہی وجہ ہے کہ عیدین کی ان تقریبوں کی رونق میں آج تک بے رونقی نہیں آئی اور نہ آئندہ آئیگی

دولت اطمینان کا اصل سرمایہ

ایک امیر نے قیمتی کپڑے پہن لیے ہیں کیونکہ وہ پہن سکتا ہے اور لذیذ کھانے کھا لیے ہیں، اس لیے کہ اسے میسر ہیں۔ اسے ان قیمتی کپڑوں کے پہننے اور عمدہ کھانے کھانے پر خوش ہونے اور اترانے کا بھی حق ہے اور پھر اس کے مقابلے میں غریب کے لیے

یہ صورتِ حال قابلِ رشک بھی ہے۔ اسی طرح کمزور کو طاقتور کی اکڑ فوں، محکوم کو حاکم کا غرور اور نخوت یقیناً کھٹکتا ہے اور کھٹکنا چاہیئے لیکن جس وقت وہ سب کو ایک ہی صف میں کھڑا دیکھتا ہے اور سب کے سب ایک جیسے سطحِ زمین پر جبینِ نیاز رکھے ہوئے ایک جیسے الفاظ میں ایک ہی طرح کے عجز و نیاز اور انکسار و درماندگی و بے بسی کا اظہار ایک ہی کے سامنے کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو سارے رشک اور تمام رقابتیں یکسر ختم ہو جاتی ہیں۔ اس لیے کہ اللہ کی یاد ہی ایک ایسا روحانی اور اخلاقی سرمایہ ہے جس پر سب کو یکساں دسترس حاصل ہے اور جس پر کسی ایک ہی کی اجارہ داری نہیں اور پھر دل کے اطمینان کا حقیقی سامان بھی اس کے سوا کوئی نہیں۔

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ط (آگاہ رہو کہ صرف اللہ کی یاد ہی سے دل مطمئن ہو سکتے ہیں۔)

رہا عید کے تحفے تحائف کا معاملہ اور ایک گھر سے دوسرے گھر میں کھانوں کے مبادلے کا سوال۔ سو اس میں لینے والے اور دینے والے اگر اتنی سی اصلاح کر لیں جسے ان لوگوں نے خود بگاڑ رکھا ہے کہ یہ لین دین اصل اسلامی روح کے تحت ہو اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق تَهَادُوا تَحَابُّوا (ایک دوسرے کو تحفے دو اور باہمی محبت بڑھاؤ) کے مقدس جذبے کی تربیت اور بالیدگی کی غرض سے ہو نمود و نمائش اور بڑا بننے اور چھوٹا بنانے کی بنا پر نہ ہو، تو یقیناً اس مقدس تقریب کی روحانی قدریں محفوظ رہیں اور صحیح فوائد مرتب ہوں۔

غریبوں اور حاجت مندوں کو جو دیا جائے صدقۂ فطر ہو یا کچھ اور، وہ انہیں خود تلاش کر کے ان کے گھر پہنچایا جائے۔ عید کے دن وہ دربدر ہو کر قومی شان و شوکت اور عید کے صاف چہرے پر بدنما داغ نہ بنیں جس سے عید نہ لینے والوں کے لیے عید رہے اور نہ دینے والوں کے لیے۔

محتاج بھی عید کے دن وہی کھانے کھاتے ہیں جو امیر کھاتے ہیں لیکن امیر امیر، امیروں کے گھر خود پہنچاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ دینے کے اس طریقہ سے دینے اور لینے والے دونوں کی عزت بن جاتی ہے ــــ لیکن غریب وہی کھانا جب امیر کے دروازے پر آکر لیتا ہے تو جہاں غریب کا ضمیر پامال ہوتا ہے، وہاں امیر کا دماغ بھی نخوت و غرور کی گندگی سے محفوظ نہیں رہتا۔ اور پھر یہ دنیا امیرانہ بالادستی کی ٹھاٹھ میں تو شمار ہو سکتا ہے، محبت بڑھانے والے تحفے یا بارگاہ ایزدی میں شرف قبول پانے والے مخلصانہ صدقے میں شمار ہو یا نہ ہو۔

(الغرض عید کی تقریب سعید کا اجتماع اگر ان آداب اور حدود و قیود کے تحت منعقد ہو جو شارع علیہ السلام نے مقرر فرمائے ہیں تو یہ اتنا مبارک اجتماع ہے کہ کسی قوم کی اجتماعی زندگی کی روح و رواں بن سکتا ہے۔

گو آج بد قسمتی سے مسلمانوں نے اس دن میں اکثر مقامات پر میلے لگانے کی بدرسمی جاری کر رکھی ہے لیکن پھر بھی عید گاہوں اور مسجدوں کے صحن اب بھی خدا کے فضل سے لہو و لعب کے ہنگاموں سے بالکل بچے ہوتے ہیں۔ یہ یقیناً دو رکعت نماز کی پابندی اور اس کے لیے مسجد کے تقید کی برکت ہے۔ ورنہ مسلمانوں کی وہ خود ساختہ تقریبیں جن میں پابندیاں شامل نہیں ان میں اسلام اور دین کے نام پر جو جو قباحتیں اور بدرسمیاں شامل ہو چکی ہیں اور دن بدن ہو رہی ہیں۔ ڈھکی چھپی نہیں)

میلادالنبیؐ

ملک، قوم اور حکومت کے سہاروں سے بے نیاز ایک لازوال یادگار

منت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنی　　منت شناس ازو کہ بخدمت گذاشتت

(یادگاروں کے بہانے جو تہوار منائے جاتے ہیں یا تہواروں کی صورت میں جو یادگاریں منائی جاتی ہیں، ان میں شاید سب سے بڑا تہوار میلادالنبیؐ کا جشن ہے۔ جو ہر سال خواہ کوئی سن ہو ہر بارہ ربیع الاول کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا دن سمجھ کر بڑے تزک و احتشام سے منایا جاتا ہے اور اب پاکستان میں اس جشن کو حکومت کی تائید بھی پوری پوری حاصل ہے، اس لیے جشن کی حیثیت سے اس کا اہتمام پہلے سے کئی گنا بڑھ گیا ہے)

پورے وثوق سے کسی ایک تاریخ کا تو تعین نہیں کیا جا سکتا۔ کہ ماضی قریب میں یہ سلسلہ کب شروع ہوا۔ البتہ اس ترقی اور اضافے کے سروسامان پر اب بھی حقیقت بین نگاہ سے جس حد تک دیکھا جائے اور اسلام دوست دل و دماغ کی روشنی میں جس قدر غور کیا جاتے وہ شے دور دور تک نظر نہیں آتی جسے سامنے رکھ کر یا جس کا نام لے لیکر یہ سب کچھ کیا جاتا ہے اور وہ حقیقت کہیں دکھائی نہیں دیتی جس کو بنیاد قرار دے کر یہ تمام ہنگامے برپا کیے جاتے ہیں۔

کاریں، موٹر سائیکل، سکوٹر، عام سائیکل، اونٹ، گھوڑے، ٹریکٹر، بیل گاڑیاں

پیدل، ہجوم مومنین، پھولوں کی بارش، فلمی گانوں کے ریکارڈ۔ گتکا، بھنگڑا، غرض سارے دن کی تمام ہو ہا جس محویت میں ان عاشقانِ رسول ؐ کو اوقاتِ نماز اور احترامِ مساجد و اذان کا بھی ہوش نہیں رہتا، اس سارے شور و شغب کو حضور اکرم ؐ کی ولادت باسعادت سے آخر کیا تعلق ہے؟ جس ولادت کے ظہورِ قدسی نے عالمِ انسانیت میں وہ انقلاب برپا کیا جس روحانی اور اخلاقی انقلاب کو ان تمام ساز و سامان سے دور کا بھی واسطہ نہیں جس مقدس ہستی نے اپنی بعثت کی غرض ہی مزامیر یعنی ساز و سرود کے آلات کو توڑنا پھوڑنا بیان فرمائی؛ بعثت لاکسر المزامیر[1] اور جس دربار کی قرآن پاک نے یہ شان قرار دی کہ لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ (قرآن۔ سورۃ الحجرات آیت) (اپنی آوازوں کو نبی ؐ کی آواز سے بلند مت کرو) اور جس پرجلال اور پُروقار مجلس میں ابوبکر رضؓ، عمر رضؓ، عثمان اور علی المرتضیٰ جیسے قریشی اور ہاشمی سردار اس طرح دم سادھے بیٹھتے تھے کہ کان علی رؤسہم الطیور (گویا ان کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں)۔ اس مہبطِ جبریلؑ کی مقدس فضا کی یاد کو ان شکستہ سازوں اور شور و شغب کی ان بے ہودہ آوازوں کے ہنگامے برپا کر کے منانا آخر کس قسم کی عقیدت، ارادت اور وفاداری ہے؟

ان ساز و سامان سے حیاتِ مقدسہ کے کس حصہ کی یاد کو تازہ کر کے بصورت یادگار منایا جارہا ہے؟

لہو و لعب کا سامان تو رہا ایک طرف (اس مقدس اخلاقی اور روحانی یاد کو تازہ رکھنے منانے اور روز و شب مناتے رہنے کے لیے دنیا کے کسی مادی سرمائے کی سرے سے ضرورت ہی نہیں۔ بلکہ اس یاد کو تازہ رکھنے کے لیے اصل سرمایہ وہ پاک تعلیم ہے جو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کر کے خود اسلام کے نام لیواؤں اور عقیدتمندوں کے نام کو ابدی سہارا دیا۔ یہ یادگار ہمارے مادی ساز و سامان کی محتاج نہیں بلکہ ہم

---

[1] میں اس لیے مبعوث کیا گیا ہوں کہ مزامیر کو توڑوں۔

اس لازوال تعلیم کی برکتوں کے محتاج ہیں جو میلادِ مقدس کی یادگار سے متعلق ہیں ہم اس یاد کو سہارا نہیں دے سکتے بلکہ ہمارا وجود اس یادگار کے سہارے کا رہینِ منت ہے۔

ع منت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمے کُنی
منت شناس ازو کہ بخدمت گذاشتت

(یہ احسان نہ جتا کہ تو بادشاہ کی نوکری کر رہا ہے بلکہ بادشاہ کا احسان سمجھ جس نے تجھے ملازمت اور نوکری کا سہارا دے رکھا ہے)

نبی اور اُمّت کا باہم تعلق

امت کا اپنے پیغمبر کے ساتھ اصل تعلق اتباعِ سنت اور اسوۂ حسنہ کی پیروی کا ہے۔ اس حقیقی تعلق کے مقابلے میں باپ بیٹے اور بیٹے باپ کے تعلق کا بھی کوئی وزن نہیں۔ حضرت نوح ؑ کا اپنے بیٹے سے اور حضرت ابراہیم ؑ کا اپنے باپ سے کوئی تعلق نہیں۔ پیغمبر کے ساتھ تعلق صرف اس کے ماننے والے کو ہے۔

حضرت انس رضؓ سے روایت ہے :-

قِیل یا محمد مَن آل محمد	(کہا گیا اے محمدؐ! محمدؐ کی آل کون ہے؟
قال کل تقی	آپ نے فرمایا ہر وہ شخص جو پرہیزگار ہے)

ع یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس امت کو
وصالِ مصطفویؐ افتراقِ بولہبی

اس لیے میلاد کی یاد کو تازہ کرنے اور تازہ رکھنے کے لیے ہمیں نئے نئے بانت نئے مادی سامان فراہم کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ تعلیمِ نبویؐ اور اسوۂ حسنہ کے اس اصل سرمایہ کی تلاش ضروری ہے جو بعثتِ نبوی کی غرض و غایت ہے اور جسے محسنِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دے کر انسانیت کی بقا کا اہتمام فرمایا اور اس یاد کے سلسلہ

میں ایسے عوامل اور رسوم سے دور رہنا مناسب بلکہ ضروری ہے جو حضور انور ﷺ کی مقدس تعلیم کے منافی اور خلافِ شان ہیں۔

یادگاروں کی اصل بنیادیں

تاریخی یادگاروں کے مآخذ اور بنیادوں کی جس قدر تحقیق و تفتیش کی جائے اس سلسلے کی آخری کڑی کوئی "ملک" کوئی "قوم" اور کوئی "حکومت" ہی نظر آئے گی۔ ان ہر سہ مآخذوں کا تجزیہ ہماری نگاہ میں حسبِ ذیل ہے:۔

۱۔ ملک

ایک ملک کی جغرافیائی حدیں متعین ہوئیں تو اس ملک کی تاریخی بنیاد قائم ہو گئی اور پھر اس کی تاریخ اس وقت تک چلتی رہے گی جس وقت تک یہ حدیں قائم رہیں گی لیکن جونہی حادثاتِ زمانہ نے جس طرح یہ حدیں متعین کی تھیں۔ ان حدود کو توڑ کر دوسرے ملکوں کی حدوں میں شامل کر دیا گیا۔ اس ملک کی تاریخی حیثیت بھی اسی وقت ختم ہو گئی اور رفتہ رفتہ اس کا نام بھی یادوں سے محو ہو گیا۔

۲۔ قوم

بنی نوع انسان کے کسی باہمت فرد نے اپنی عالی ہمتی اور بہادرانہ کارناموں سے اگر دوسرے بنی نوع کو شکست دے کر اپنی حیثیت کو دوسروں سے نمایاں کر لیا تو اس کی آئندہ نسل دوسروں کی نسبت ممتاز مان لی گئی اور اس مورث کے نام پر ایک علیحدہ قوم کی بنیاد قائم ہو گئی (قوموں کے نام ہمیشہ اپنے مورث کے نام پر ہی مشہور ہوئے ہیں اور ہوتے رہے ہیں)۔

قوم کا وجود اس وقت تک قائم رہتا ہے اور رہ سکتا ہے جس وقت تک کم و بیش اس قوم کی موروثی روایات قوم کے افراد میں موجود رہیں۔ تاہم قوم کا وجود اس کے افراد کے

جسدِ عنصری سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور اس کی آخری حد زیادہ سے زیادہ اہلِ نسب کی حیات مستعار تک ہے اور بس۔

۳۔ حکومت

تاریخی یادگاروں کا تیسرا اور آخری مآخذ حکومت کا وجود ہے۔ حکومت ملکوں اور قوموں کو بھی اپنے ساتھ شامل کر کے تاریخی روشنی میں لے آتی ہے اور دنیا میں ایک ایسا مقام حاصل کر لیتی ہے جس کے تذکرے ایک طویل مدت تک اہلِ عالم کی زبان پر چلتے رہتے ہیں۔

لیکن یہی تذکرے اس حقیقت پر بھی زندہ شہادت ہیں کہ گردشِ افلاک کے سیلِ بے پناہ نے ہزارہا حکومتوں کے تختے ایسی حالت میں اُلٹے ہیں کہ خود حکمران قومیں اپنے وقارِ رفتہ اور از دست دادہ اقتدار کو حسرت سے دیکھتی رہ گئیں اور ملک و دیار، عالی شان یادگاریں اور شہنشاہی ایوانِ حکومت کھڑے اپنے حکمرانوں کا ماتم کرتے رہ گئے۔

ے آں قصر کہ برچرخ ہمے زد پہلو | بر درگہ او شہاں نہادندے رو
دیدیم کہ بر کنگرہ اش فاختۂ | بنشستہ ہمے گفت کہ کوکو! کوکو!!

(وہ سر بفلک شاہی محلات جن کے آستانوں پر کئی بادشاہ ماتھے رگڑتے تھے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ان محلات کے کنگروں پر فاختہ بیٹھی آواز دے رہی ہے کہ وہ کہاں ہیں! کہاں ہیں!! کہاں ہیں آخر کہاں ہیں!!!)

ے آں قصر کہ بہرام دروجام گرفت | آہو بچہ کرد و شیر آرام گرفت
بہرام کہ گورمے گرفتے ہمہ عمر | دیدی کہ چہ طور گور بہرام گرفت

(وہ شاہی محل جن پر بیٹھ کر شہنشاہ بہرام گور جامِ شراب پیتا رہا، وہاں آخر ہرنیوں نے بچے دیے ایسے برباد ہوتے کہ شیروں نے ان میں اپنے

بھوٹ بنائے۔ وہ بہرام گور جو ساری عمر گورخروں کا شکار کرتا رہا تم نے دیکھا کہ بہرام گور کو گور (قبر) نے کیسے دبوچا!")

حکومتوں کے خاتمے اور تباہی و بربادی کا عبرت پذیر نگاہوں نے کیسا کیسا دردناک منظر پیش کیا ہے۔

پردہ داری مے کند بر طاقِ کسریٰ عنکبوت
چغد نوبت مے زند بر گنبدِ افراسیاب

(نوشیرواں کے دروازے پر مکڑی جالا تن کر پردہ داری کر رہی ہے اور افراسیاب کے گنبد پر اُلّو بول رہے ہیں)

اب ان تینوں بنیادوں کا نمبروار تجزیہ ملاحظہ ہو:

۱۔ سرکارِ دو عالم تاجدارِ مدینہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی غیر فانی سلطنت کے وسیع ملک کی حدیں ایسی تجویز کی ہیں جو جغرافیائی خطوط اور حدود و ثغور کی محتاج نہیں اور جن کے محو و اثبات یا تجدید و تحدید کے اختیارات کسی مادی قوت کے ہاتھ میں نہ تھے بلکہ ان کی بنیاد عقلی وسعت اور روحانی پہنائی پر رکھی گئی۔ تاکہ مادی دنیا کے حوادث کی دستبرد کا اثر وہاں تک نہ پہنچ سکے۔ یہ وسعت سارے عرب و عجم اور جنّ و انس پر یکساں محیط ہے اور اس میں کسی ملک کے کسی باشندے کو کوئی خصوصیت حاصل نہیں۔

لافضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی — کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ ہی کسی عجمی کو عربی پر۔

ملک کے وجود اور جغرافیائی حدود کے تصور کو پیمانوں سے ایسا دور رکھا کہ آپ کے جانشین اور مزاج شناسانِ نبوت نے بھی اپنا سن رائج کرتے وقت دنیا کی دوسری تمام قوموں کی طرح کسی ملک کی فتح و تسخیر کو نہیں بلکہ اپنا آبائی ملک چھوڑنے اور وہاں سے ہجرت کر کے نکل جانے کو بنیادی نقطہ قرار دیا اور اسی پر ہجری سن کی بنیاد رکھی۔

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمدؐ عربی سے ہے اُمّتِ عربی!

(ب) قوم اور نسل کے غیر عقلی تصور اور عقیدے کو اس طرح مٹایا کہ عرب جیسے نسل پرست ملک میں اگر ایک طرف خاندان شہنشاہ نوشیرواں کے چشم و چراغ سلمانؓ فارسی نے اسلام قبول کرنے کے بعد صرف سلمان بن اسلام کہلانا پسند کیا تو دوسری طرف حبش کے رہنے والے غلام بلالؓ کو وہ رتبہ حاصل ہوا کہ اشرافِ عرب کے سرخیل عمر فاروقؓ جیسے قریشی سردار نے اسے سیّدنا (ہمارے سردار) کہہ کر پکارا، اور خود سرکارِ مدینہؐ نے نسبی شرف و مجد کے پورے امتیاز کے باوجود، کسی درماندگی اور شکست کی حالت میں نہیں بلکہ عین اس وقت جب کہ ملک اور بیرونِ ملک کی کوئی مخالف قوت باقی نہیں رہ گئی مکہ فتح ہو چکا ہے اور ملک کی بیشتر قوتیں لوٹ چکی ہیں۔ حجۃ الوداع کے دن جب اسلامی حکومت کا منشوری اعلان ہو رہا ہے۔ لا فخر للانساب (اب نسب پر فخر نہیں کیا جائے گا) فرما کر غرورِ نسل کے تابوت میں آخری میخ گاڑ دی۔

(ج) رہا تیسرا سوال حکومت کا جو کسی تاریخی یادگار کا ماخذ بن سکتی ہے۔ سو یاد رہے کہ حکومت سرے سے اسلام کی نگاہ میں کوئی مقصود بالذات چیز ہی نہیں، بلکہ ایک صالح جماعت کو یہ قوت ضمناً حاصل ہوتی ہے۔ اسلامی تاریخ کے لیے حکومت تاریخی بنیاد نہیں بن سکتی بلکہ اسلامی تاریخ خود حکومتوں کی خالق ہے۔

ریگستانِ عرب کے ایک یتیم (فداہ ابی و امی) نے انسانی زندگی کے ایسے ہمہ گیر اور پائیدار اصول و قواعد پیش کیے جو اپنی یادگاری بنیادوں کے لیے نہ ملک کے محتاج ہیں اور نہ نسل و حکومت کے۔ آپؐ کی ولادت خود ایک مستقل اور ناقابلِ فراموش تاریخی ماخذ ہے، کیونکہ آپؐ نے اپنی یادگار کسی مادی نشانات کو قرار نہیں دیا بلکہ عالمِ انسانیت کے لیے اپنا "اُسوۂ حسنہ" یادگار چھوڑا ہے جس پر ہماتات زمانہ حکومتوں کے

تغیر و تبدّل اور ملکی و سیاسی انقلابات کا کوئی اثر نہیں۔ نیکی اور بدی، حق و باطل اور صدق و کذب کی تفاوت کے فطری حقائق اور اخلاقی قدریں، ملکی حدود کی پابند، نسلی اور خاندانی ملکیت کی مرہون و منت کش اور حاکمانہ قوت کی محتاج رہی ہیں اور نہ کبھی رہیں گی۔

مسلمانوں کو چاہیئے کہ اگر آقائے نامدار (فداہ ابی و امّی) کی عقیدت مندانہ یادگار منانا چاہتے ہیں تو اسی اخلاقی، عقلی اور روحانی حق وراثت کی بنا پر منائیں۔ جو اس رحمت عالم نے اپنے جانشینوں اور سچے وارثوں کے لیے چھوڑا ہے۔

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِی رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ ۔ بے شک تمہارے لیے رسول اللہ کی زندگی میں بہترین دستور العمل موجود ہے۔

اور اس غیر فانی دولت اور نہ ختم ہونے والے ترکہ کو اپنے اہل ملک، خاندان اپنی قوم اور نسل ہی کے لیے مخصوص نہیں رکھا، بلکہ اس رحمۃ للعالمین نے ساری دنیا، تمام بنی نوع اور کل نسل آدم کے ہر فرد کو اس اخلاقی ترکے میں صرف اتنی آسان سی شرط پر حقیقی وارث قرار دیا کہ وہ فقط وارث بننا پسند کرنے یعنی اسلام قبول کرلے اور پھر اس ترکہ میں یہ قید بھی نہیں کہ وارثوں کی تعداد بڑھ جانے سے حصہ کم ہو جانے کا اندیشہ ہو، بلکہ یہ ایسی روز افزوں دولت ہے کہ ہر وارث یہ اخلاقی سرمایہ سارے کا سارا حاصل کر سکتا ہے اور دوسرے کے حصہ میں بھی کمی پیدا نہیں ہوتی۔ اللھم صل علی محمد و علی اٰل محمد کما صلیت علی ابراھیم و علی اٰل ابراھیم انک حمید مجید۔

سنت و بدعت کا اہم سوال

جہاں پہلے لوگوں نے تاریخ اسلام کے ان قابل فخر واقعات اور حضور اکرمؐ کی امتیازی خصوصیات کو بڑے شوق سے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر لکھا ہے وہ

عوام کے لیے ہدایت ورہنمائی کا زیادہ سے زیادہ مقدس سرمایہ فراہم کرنے کی کوشش کی ہے، آج دورِ حاضر کے درد دل رکھنے والے علمائے حق کو ان ہی ہدایت کے نشانات کی جگہ گمراہی کے جھنڈے گڑے دیکھ کر اور بدعات کے سربفلک بلند قلعے تعمیر شدہ پاکر ان کے خلاف جہاد کرنا بھی ضروری خیال کرنا پڑا۔ ان اللہ کے بندوں نے جہاں بھی اور جب بھی ایسی صورتِ حال دیکھی، اس کے خلاف آواز بلند کی، آج ہماری علمی دنیا میں ردِّ بدعات کا ذخیرہ بھی کم نہیں۔ لکھنے والوں نے بلاخوف لومۃ لائم لکھا ہے اور برابر لکھ رہے ہیں۔ شکر اللہ سعیہم ط

میلاد النبی ؐ کے متعلق شیخ عبدالعزیز بن باز جو ریاض (سعودی عرب) میں علمی مباحث، افتاء اور دعوت وارشاد کے رئیس عام ہیں، آپ نے چند تقریبات کے مروجہ طور طریقوں یا بہ الفاظ دیگر چند بدعات کے متعلق کتاب وسنت کی روشنی میں ایک رسالہ لکھا ہے جس کا ترجمہ پاکستان میں شائع ہو چکا ہے۔ ذیل میں اس مختصر مگر جامع بیان کو نقل کیا جاتا ہے تاکہ قارئین سنت و بدعت میں امتیاز کر سکیں۔

ایک اقتباس

الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علی رسول اللہ وعلیٰ آلہ وصحبہ ومن اھتدیٰ بھُداہ!

حضور علیہ السلام کی پیدائش کے دن کو تہوار کے طور پر اہتمام سے منانے اور اس دن کھڑے ہو کر خصوصی سلام پڑھنے کے متعلق کئی مرتبہ سوال ہوا ہے کہ شریعت اسلامیہ میں اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: حضور علیہ السلام یا ان کے علاوہ اور کسی کی پیدائش کے دن خاص اہتمام کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ یہ تمام امور بدعت ہیں۔ حضور علیہ السلام یا صحابہ کرام سے اس کا ثبوت نہیں ملتا اور نہ ہی تابعین عظام نے اس کا اہتمام فرمایا ہے۔ حضور ؐ

کا فرمان ہے:

من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منه فھو رد۔	ہمارے دین اسلام میں جو بھی کسی نئے کام کا اضافہ کیا جائے وہ مردود اور نا قابل قبول ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے:۔

علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المھدیین من بعدی تمسکوا بھا وعضوا علیھا بالنواجذ وایاکم ومحدثات الامور فان کل محدثة بدعة وکل بدعة ضلالة	میری سنت پر عمل کرو اور میرے خلفاء کے طریقے کو مضبوطی سے پکڑو جو ہدایت یافتہ ہیں اور بدعات وخرافات سے اجتناب کرو کیونکہ ہر نیا کام بدعت ہوتا ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

ان دو حدیثوں میں بدعت کے ارتکاب پر سختی کی گئی ہے۔

اللہ تعالٰے فرماتے ہیں:۔

۱ - وما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنه فانتھوا۔ (قرآن)	میرا رسول جو کچھ تمہیں دے اسے لے لو اور جس سے منع کرے اس سے رک جاؤ۔
۲ - فلیحذر الذین یخالفون من امرہ ان تصیبھم فتنة او یصیبھم عذاب الیم۔ (قرآن)	جو لوگ ہمارے رسول کی مخالفت کرتے ہیں انہیں دنیا میں آزمائش اور آخرت میں دردناک عذاب سے ڈرنا چاہیئے۔
۳ - لقد کان لکم فی رسول اللہ	ہمارا رسول تمہارے لیے بہترین

اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الاخر وذکر اللہ کثیراً ہ
نمونہ ہے جو انسان اللہ سے قیامت کے دن اچھے انجام کی توقع رکھتا ہے اور اللہ کو بکثرت یاد کرتا ہے وہ یقیناً رسول کی سنت پر عمل کرے گا۔

(قرآن)

۴۔ الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناہ (قرآن)
آج میں نے دین مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت کو تم پر پورا کر دیا ہے اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند فرمایا ہے۔

اس قسم کی اور بہت سی آیات ہیں۔ اگر اس قسم کے تہواروں کو منایا جائے تو مطلب یہ ہوا کہ اس امت کے لیے یہ دین نامکمل تھا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کما حقہٗ ہم تک نہیں پہنچایا اور متاخرین نے ان بدعات کو جاری کر کے بزعم خویش دین کی تکمیل کی ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی خرافات سے ہمیں اللہ کا قرب حاصل ہو گا۔ اللہ تعالےٰ اور اس کا رسول اس سے بری ہیں، اس نے اپنے بندوں کے لیے دین کو مکمل اور اپنی نعمت کو پورا کر دیا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین اسلام کو ہم تک پہنچا دیا ہے اور ایسا کوئی راستہ نہیں چھوڑا جو جنت کے قریب اور جہنم سے دور رکھنے والا ہو۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے:

ما بعث اللہ من نبی الا کان حقا علیہ ان یدل امتہٗ علی خیر ما یعلمہ لھم وینذرھم شر ما یعلمہ لھم۔
ہر نبی کا یہ فریضہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی امت کو خیر خواہی کے کاموں کی تعلیم دے اور برے کاموں سے بچنے کی تلقین کرے

اور معلوم ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیا سے افضل اور اعلیٰ ہیں اور دین کو پہنچانے کے لحاظ سے کامل ہیں اور اس قسم کی محافل کا اہتمام اگر ضروری ہوتا تو ضرور بیان فرماتے اور نہ ہی صحابہ کرام یا تابعین عظام سے اس کا اہتمام ثابت ہے۔ جب قرنِ اولیٰ میں اس کا ثبوت نہیں ملتا تو واضح ہے کہ دین اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ ان امور سے ہے جو بعد کی پیداوار ہیں جو چیز بھی دین کا حصہ بنا کر دین میں داخل کر دی جائے، وہ گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں لے جاتی ہے۔ حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہر خطبہ جمعہ میں فرمایا کرتے تھے:-

اما بعد - فان خير الحديث كتاب الله وخير الهدى هدى محمد صلى الله عليه وسلم وشر الامور محدثاتها وكل بدعة ضلالة - (مسلم)	بہترین بات اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور خیر و ہدایت کا سرچشمہ سنت رسولؐ ہے اور بدترین وہ کام ہیں جو اپنی طرف سے اضافہ کر کے دین کا حصہ بنا دیے جائیں اور نیا کام گمراہی اور ضلالت پر منتج ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں بہت سی احادیث اور آیات وارد ہیں اور علمائے امت نے بھی اس قسم کی محفلوں کا انکار کیا ہے اور دلائل شرعیہ سے اس کا ناجائز ہونا ثابت کر کے ان سے بچنے کی تلقین فرمائی ہے۔ البتہ بعض متاخرین نے چند شرائط کے ساتھ اسے جائز قرار دیا ہے۔ مثلاً:-

۱- اللہ تعالیٰ کے رسولؐ کے متعلق غلو نہ کیا جائے۔

۲- مرد اور عورتوں کا باہمی اختلاط نہ ہو۔

۳- آلاتِ موسیقی کا استعمال نہ ہو۔ وغیرہ۔

اور انہوں نے یہ سمجھا ہے کہ یہ بدعت حسنہ ہے، شریعت مطہرہ کا یہ قاعدہ ہے کہ جس معاملے میں نزاع پیدا ہو جائے تو اسے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر پیش کیا جائے۔ جیسا کہ فرمان خداوندی ہے:۔

یایها الذین امنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیءٍ فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الاخر ذلک خیر واحسن تأویلا ٥

ایمان والو! اللہ اور اس کے رسولؐ کا کہا مانو اور اپنے حکمرانوں کی بات کا بھی انکار نہ کرو، البتہ تنازع اور اختلاف کی صورت میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں حق تلاش کیا جائے اگر تم مومن ہو اور آخرت پر تمہارا یقین ہے تو اسی طرح چلو یہی مسلمان کا راستہ اور انجام کے لحاظ سے بہتر ہے۔

دوسرے مقام پر فرمایا:۔

وما اختلفتم فی شیءٍ فحکمہٗ الی اللہ۔

(قرآن)

جس امر کے متعلق تم میں اختلاف ہو جائے اسے اللہ کی طرف واپس کرو (نبی اللہ کی شریعت میں اس کا حل تلاش کرو۔

تو ہم نے اس مسئلہ کو اللہ کی کتاب پر پیش کیا تو اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی کتاب میں ہمیں اتباع رسول کا حکم دیتے ہیں۔ نیز اس نے اپنے دین کو مکمل کر دیا ہے۔ اس قسم کے دنوں کا اہتمام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں تو نتیجہ یہ نکلا کہ یہ امر دین سے نہیں ہے جو آسمان سے اتارا گیا ہے اور جس کی اتباع کے ہم مامور ہیں۔ اسی طرح ہم

نے اسے سنتِ رسول ﷺ پر پیش کیا تو معلوم ہوا کہ نہ اسے حضور اکرم ﷺ نے خود کیا ہے اور نہ ہی یہ صحابۂ کرام سے ثابت ہے اور نہ ہی اس کا حکم دیا گیا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ یہ ان بدعات اور محدثات سے ہے جو بعد میں جاری کی گئی ہیں اور انہیں دین کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ دراصل یہ یہود و نصاریٰ سے مشابہت ہے کہ وہ بھی عیسیٰ علیہ السلام کا دن بڑے اہتمام سے مناتے ہیں۔ جس انسان کو تھوڑی سی بصیرت بھی ہے اور وہ تلاشِ حق میں شوق رکھتا ہے، اور عدل و انصاف کا چاہنے والا ہے، جانتا ہے کہ اس قسم کی محفلِ میلاد کا انعقاد دین سے نہیں بلکہ ان امور سے ہے جن کے ترک کرنے اور ان سے بچ کر رہنے کا ہمیں حکم ہوا ہے۔ میلاد منانے والوں کی اکثریت دیکھ کر عقل مند کو دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے کیونکہ حق کثرت سے نہیں بلکہ شرعی دلیل سے پہچانا جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے متعلق فرمایا ہے:۔

وقالوا لن یدخل الجنة الا من کان هوداً او نصاریٰ تلك امانیهم قل هاتوا برهانكم ان كنتم صدقین ٥ (قرآن)	انہوں نے کہا کہ یہود و نصاریٰ کے سوا اور کوئی ہرگز جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ یہ تو ان کے دل کی باتیں ہیں کہہ دیجئے اگر تم سچے ہو تو اس دعویٰ کو دلیل سے ثابت کرو۔

دوسرے مقام پر فرمایا:۔

وان تطع اكثر من فی الارض یضلوك عن سبیل الله (قرآن)	اگر تو اکثریت کی بات مانے گا تو یہ تجھے ضرور اللہ کے راستے سے روک دیں گے۔

پھر اس قسم کی محفلیں بدعت ہونے کے ساتھ ساتھ منکرات و فواحش پر مشتمل ہوتی ہیں۔ مردوں اور عورتوں کا باہمی اختلاط، گانے بجانے اور آلاتِ موسیقی کا استعمال

شراب اور دیگر منشیات کا استعمال اس پر مزید ہے۔ بسا اوقات تو شرک اکبر کا بھی ارتکاب کیا جاتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالےٰ کے رسول کی مدح و تعریف میں غلو، اولیاء اللہ سے مدد طلب کرنا اور عقیدہ رکھنا کہ وہ غیب دان ہیں۔ اس قسم کے دیگر امور کفریہ ان محفلوں میں انجام دیے جاتے ہیں۔ حضور اکرم صلعم نے صراحتہً فرمایا ہے:

ایاکم والغلو فی الدین فانما اھلك من كان قبلكم الغلو فی الدین۔	دین میں غلو کرنے سے بچو کیونکہ تم سے پہلے لوگ دین میں غلو کی وجہ سے ہلاک ہوتے ہیں۔

دوسری حدیث میں ہے:

لا تطرونی کما اطرت النصرٰی ابن مریم انما انا عبد فقولوا عبد الله ورسوله	میری تعریف کے وقت حد سے تجاوز نہ کرو جیسا کہ عیسائیوں نے عیسٰی بن مریم کو خدا کا بیٹا بنایا۔ میں اس کا بندہ ہوں اس لیے اس کا بندہ اور رسول کہو۔

یعنی مجھے اس قدر مت بڑھاؤ۔ جیسا کہ نصارٰی نے ابن مریم کو بڑھا دیا، میں تو صرف بندہ ہوں۔ مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہا جاتے اور پھر یہ عجیب بات ہے کہ اکثر لوگ اس قسم کی محفلوں میں حاضری کا تو بہت اہتمام کرتے ہیں لیکن اللہ تعالےٰ کے حقوق و فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ ایمان کی کمزوری اور خداداد بصیرت کی کمی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ہم عافیت چاہتے ہیں۔ بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس قسم کی محفلوں میں بہ نفس نفیس تشریف لاتے ہیں اور اسی لیے یہ لوگ سلام پڑھتے ہوئے اور اھلاً وسھلاً کہتے ہوئے تعظیماً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ سب سے بڑا جھوٹ اور بدترین جہالت کا نتیجہ ہے

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم قیامت سے پہلے اپنی قبر مبارک سے نہیں نکلیں گے اور نہ ہی کسی سے ملاقات کا امکان ہے اور نہ ہی وہ ان اجتماعات میں حاضر ہوتے ہیں بلکہ وہ تو قیامت تک اپنی قبر میں تشریف فرما ہیں اور ان کی روح پروردگار عالم کے پاس اعلیٰ علیین میں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں:

ثم انکم بعد ذلك لميتون ثم انكم يوم القيامة تبعثون ۝

پھر تم یقیناً اس کے بعد مرنے والے ہو، پھر بے شک تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔

اور حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔

انا اول من ينشق عنه القبر يوم القيامة فانا اول شافع واول مشفع

قیامت کے دن قبر سے میں سب سے پہلے اٹھوں گا اور سب سے پہلے سفارش کروں گا اور سب سے پہلے میری سفارش قبول ہوگی۔

یہ آیت کریمہ اور یہ حدیث شریف دلالت کرتی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فوت ہو چکے ہیں اور قیامت کے دن اپنی قبر سے نکلیں گے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو علمائے امت کے اجماع سے ثابت ہے کسی کو بھی اس میں اختلاف نہیں۔ مسلمان کو چاہیئے کہ اس قسم کے امور میں چوکس رہے اور جاہلوں نے جو بدعات اور خرافات ایجاد کر رکھی ہیں۔ ان سے اجتناب کرے۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

درود وسلام

باقی رہا پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام پر درود وسلام کا مسئلہ، تو یہ نہایت

ہی بابرکت عمل اور نیک کام ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

ان اللہ وملٰئکتہ یصلون علی النبی یاایھا الذین اٰمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما ط

اللہ تعالیٰ اپنے نبی پر رحمت بھیجتے ہیں۔ اور فرشتے بھی دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ بنابریں ایمان داروں کو بس چاہیئے کہ اللہ کے رسول پر درود وسلام بکثرت پڑھا کریں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے:۔

من صلی علیّ واحدۃ صلی اللہ علیہ عشراً۔

جو انسان مجھ پر ایک مرتبہ درود پڑھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر دس مرتبہ رحمت بھیجتے ہیں۔

یہ درود وسلام ہر وقت ہی مشروع ہے۔ ہر نماز کے بعد اس کی تاکید کی گئی ہے آخری تشہد میں علماء کی اکثریت کے نزدیک واجب ہے۔ اذان کے بعد اور جمعہ کے دن اور رات کو اور جب آپ کا نام مبارک لیا جائے اور اس قسم کے دیگر مواقع پہ خصوصیت کے ساتھ پڑھنا چاہیئے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں دین کو سمجھنے اور اس پر ثابت قدم رہنے کی توفیق دے اور طریقۂ نبوی کے مطابق عمل کرنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔ اور بدعات وخرافات سے بچائے رکھے۔ انہ جواد کریم وصلی اللہ علیہ وسلم علیٰ نبینا محمد واٰلہ وصحبہ۔"

(انتھیٰ)

(عبدالعزیز بن باز)

شبِ معراج

آجکل جن تہواروں کو مسلمان اسلامی تقریبات کا نام دے کر بڑی عقیدت، ارادت اور احترام کے ساتھ منا رہے ہیں، ان میں ایک شبِ معراج بھی ہے۔ یہ رات مسلمان قوم کے لیے اس لحاظ سے واقعی بہت بڑے فخر کا سرمایہ ہے کہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بلند رتبہ پر عروج و ترفع حاصل ہوا اور اس حیثیت سے ہوا جو انبیائے سابقین کو اس واضح صورت میں نہیں ہوا۔ گو ہر پیغمبر نے اپنے اپنے درجے اور مقام یا وقت اور حالات کے مطابق مختلف صورتوں میں یہ فخر حاصل ضرور کیا ہے اور پھر اسلامی دعوت کے لحاظ سے بھی اس واقعہ کو جو تاریخی حیثیت حاصل ہے، اس کی اہمیت سے بھی کوئی دوست دشمن انکار نہیں کر سکتا۔

تیرہ سالہ مکی زندگی کا یہ آخری دور ہے۔ مخالفوں کی طرف سے مخالفتیں اور اذیتیں نقطۂ عروج پر پہنچ چکی ہیں، یہاں تک کہ حضور اکرم ؐ کے قتل کے منصوبے سوچے جا رہے ہیں۔ آپ کے چچا ابوطالب جو بچپن سے آپ کے سرپرست اور ہمدرد تھے، فوت ہو چکے ہیں اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ آپ کی حرم محترم سب سے پہلے ایمان لانے والی، مکہ شہر میں سب سے بڑی مالدار اپنا سارا مال راہِ خدا میں تبلیغی مشن پر خرچ کر کے وہ بھی فوت ہو چکی تھیں۔

آپ اہلِ مکہ کی طرف سے مایوسی کے بعد تبلیغی مہم کے سلسلہ میں طائف شہر تشریف لے جاتے ہیں، جہاں بنو ثقیف آباد تھے۔ عبد یا لیل، مسعود اور حبیب تینوں

بھائی شہر کے رئیس تھے۔ آپ سب سے پہلے انہیں سے ملے۔ زمین کی سرسبزی اور شہر کی خوش حالی نے انہیں انتہائی مغرور بنا رکھا تھا۔ ایک نے کہا میں کعبے کے سامنے ڈاڑھی منڈوا دوں اگر خدا نے تجھے رسول بنا کر بھیجا ہو۔ دوسرا بولا "خدا کو رسول بنانے کے لیے تو ہی مل سکا۔ جسے یہاں تک آنے کے لیے سواری بھی میسّر نہیں ہوئی۔ اگر خدا کسی کو رسول بنانا چاہتا تو ان دو بڑے شہروں میں سے کسی سردار اور رئیس کو بنایا ہوتا تیسرے نے بڑے غرور سے کہا میں تم سے کسی صورت بات کرنا پسند نہیں کرتا۔ اگر تو فی الواقع رسول ہے تو گستاخی سمجھتا ہوں اور اگر رسول نہیں تو ایسے جھوٹے سے بات کرنا میرے خلافِ شان ہے۔

یہی نہیں شہر کے لونڈوں کو پیچھے لگا دیا جنہوں نے پتھر مار مار کر لہولہان کر دیا۔

ان انتہائی یاس انگیز اور حوصلہ شکن حالات میں معراج کا واقعہ سامنے آتا ہے اسے ان صبر آزما مصائب کا ردِ عمل سمجھو یا مدینہ طیبہ میں پہنچ کر تاسیس حکومتِ الٰہیہ کی تمہید اور خلافتِ کبریٰ کا پیش خیمہ قرار دو۔ بہرحال یہ اسلامی تحریک کا اہم موڑ ہے جس پہ خالقِ کائنات نے کرۂ ارض پر اپنی حکومت کے نائب (رسولِ اکرمؐ) کو بالاصالت حضوری کا شرف بخش کر آئندہ مدینہ منورہ میں قائم ہونے والی حکومت کے وہ چودہ بنیادی اصول دیئے جو توحید سے چل کر ماں باپ کی خدمت پر ختم ہوتے ہیں۔ سورہ بنی اسرائیل جو معراج کے ذکر سے شروع ہوتی ہے اس کے رکوع نمبر ۳ میں انہیں بیان فرمایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بعض ایسے خاص اور اہم امور بھی ہیں جن کے متعلق صرف اتنا کہا گیا کہ اوحیٰ الیٰ عبدہٖ ما اوحیٰ (اپنے بندے کو بتایا گیا جو بتایا گیا)۔ عام روایت کے مطابق یہ ۲۷ رجب سنہ ۱۰ نبوت کا واقعہ ہے۔

اِنتباہ

ہر تقریب کا ذکر پڑھنے سے پہلے مناسب ہے کہ وہ تمہیدی مباحث جو ابتدا

میں لکھے جا چکے ہیں، انہیں پڑھ لیا جائے، اگر پڑھ چکے ہو تو ان کا مفہوم ذہن میں حاضر کر لیا جائے۔ یہ استحضار زیرِ نظر سطور کا مفہوم سمجھنا قاری پر آسان کر دے گا۔

معراج کے واقعات حدیث و سیر کی کتابوں میں مفصل درج ہیں اور علمائے حق نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے جو ایمان اور یقین کا بہترین اور قیمتی سرمایہ ہے خدا توفیق دے تو اسے پڑھو اور ایمان روشن کرو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ارادت، عقیدت اور محبت میں اضافہ کر کے رضائے الٰہی حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

معراج شاہ ولی اللہ کی نظر میں

حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ صاحب نے معراج کے واقعات پر روایات کے حوالہ سے عالمِ مثال کی ان واردات پر اپنے خاص انداز کے مطابق توضیحی اشارات بھی فرمائے ہیں۔ ذیل میں وہ مختصر اقتباس درج کیا جاتا ہے تاکہ پڑھنے والے روایات اور ان کے معانی سے آگاہ ہو کر بیک وقت دوہرا فائدہ اٹھا سکیں۔

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد اقصیٰ تک اور پھر سدرۃ المنتہیٰ تک اور جہاں کہ خدا نے چاہا، سیر کرائی۔ یہ سب کچھ جسم کے ساتھ بیداری میں تھا۔ لیکن یہ ایک مقام ہے جو مثال اور شہادت کے درمیان برزخ ہے اور ہر دو عالم مذکورہ کے احکام کا جامع ہوتا ہے۔ پس جسم پر روح کے احکام ظاہر ہوئے اور روح اور معانی نے جسم قبول کر کے مثل اختیار کیا، اسی لیے ان واقعات میں سے ہر واقعہ کی ایک حقیقت ہے۔

۱۔ صدر کا چاک کرنا "اسے ایمان سے بھر دیا جانا"۔

اس کی حقیقت ہے انوارِ ملکیہ کا غلبہ ہو جانا اور شعلۂ طبیعت کا بجھ جانا اور جو کچھ حظیرۃ القدس سے طبیعت کو فیضان ہوتا ہے، اس کے لیے مطیع بن جانا۔

۲۔ براق پر سوار ہونے کی حقیقت یہ ہے کہ نفس ناطقہ، نسمیہ پر جو کمال حیوانی ہے، غالب آجائے۔ پس آنحضرت صلعم براق پر ایسی خوبی سے سوار ہوئے جیسا کہ حضورؐ کے نفس انسانی کے احکام قوتِ بہیمیہ پر غالب اور مُسلط تھے۔

۳۔ مسجدِ اقصیٰ تک سیر اس لیے ہے کہ وہ شعائرِ الٰہیہ کے ظہور کا محل ہے، ملاءِ اعلیٰ کی ہمتیں اس سے متعلق ہیں اور وہ انبیا علیہم السلام کی نگاہوں کی نظر گاہ ہے۔ گویا وہ ملکوت کی جانب ایک رُوزن ہے۔

۴۔ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ملاقات اور مفاخرت کی حقیقت یہ ہے کہ حظیرۃ القدس سے ان کو اجتماعی ربط و ضبط حاصل ہے۔ اور پھر ان اجتماعی امور کی خصوصیات کا نہایت کاملیت اور خصوصیات کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ظہور ہُوا۔

۵۔ آسمانوں پر یکے بعد دیگرے چڑھنے کی حقیقت درجہ بدرجہ تعلقاتِ طبعی سے نکل کر مستویٰ رحمٰن کی طرف جانا ہے۔ نیز احوالِ ملائکہ کی معرفت جو اس مقام سے خصوصیت رکھتے ہیں۔ نیز ملائکہ اور نسلِ انسانی کے ان بزرگوں کے احوال کی شناخت جو ملائکہ سے ملے ہوئے ہیں نیز اس تدبیرِ کلیہ کی معرفت جو مقامِ مذکور میں وحی ربانی سے بتائی گئی۔ نیز ان امور کی شناخت جن پر ملائکہ مسابقت کیا کرتے ہیں۔

۶۔ واضح ہو کہ یہ موسیٰ ؑ سے حسد کا اظہار مراد نہیں، بلکہ اظہار اس امر کا ہے کہ ان کی رسالت تمام دنیا کے لیے عام نہ تھی، اور اس طرح ایک کمال باقی تھا جو حضرت موسیٰ ؑ کو حاصل نہ تھا۔

۷۔ سدرۃ المنتہیٰ درختِ عالم ہے کہ ایک وجود دوسرے وجود پر مترتب

اور پھر سب کے سب تدبیر واحد کے اندر جمع ہیں، جیسا کہ درخت کا بھی غذا اور نمو میں یہی حال ہے۔ واضح رہے کہ کسی حیوان سے اس کی تمثیل نہیں دی گئی، کیونکہ وہ تدبیر کلیہ اجمالیہ جو سیاستِ کلیہ سے بہت مشابہت رکھتی ہے، وہ بھی مفرد ہے اور اسی لیے بہترین مشابہت اس کی درخت میں پائی جاتی ہے کہ (ایک ہی تنہ پر مختلف شاخیں، ڈالیاں ٹہنیاں اور پتّے ہوتے ہیں اور غذا و نمو میں برابر سب مستفیض ہیں) اور حیوان میں یہ مشابہت پائی نہیں جاتی، کیونکہ حیوان میں قوائے تفصیلیہ بھی ہیں اور قوت ارادہ بھی ہے اور یہ سننِ طبیعیہ سے زیادہ صریح ہیں۔

۸۔ دریاؤں کی اصل وہ رحمتِ فائضہ ہے جو عالمِ شہادت کے محاذی عالمِ ملکوت میں موجود ہے۔ نیز حیات اور نمو بھی اس اصل میں شامل ہیں۔ اسی لیے ظاہراً چند اسباب نافعہ مثل نیل و فرات وغیرہ کا تعین کیا گیا۔

۹۔ رہے وہ انوار جنہوں نے اسے ڈھانپ لیا تھا۔ یہ وہ تدلیاتِ رحمانی اور تدبیراتِ الٰہیہ ہیں جو عالمِ ظہور میں جلوہ گستر اور نور بیز ہیں۔ جہاں تک اس عالم میں ان کی استعداد پائی جاتی ہے۔

۱۰۔ بیت المعمور کی حقیقت وہ الٰہی تجلّی ہے جس کی طرف بندگانِ خدا کی دعاؤں اور سجدوں کا رُخ ہوتا ہے اور وہ خانۂ کعبہ اور بیت المقدس کے محاذ میں ہیں۔ جیسا کہ لوگوں کا ان ہر دو کی بابت اعتقاد ہے، ایک گھر کا تمثیل لیے ہوئے ہے۔

۱۱۔ شبِ معراج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک برتن دودھ کا، اور ایک برتن شراب کا پیش کیا گیا اور آنحضرت صلعم نے دودھ کو پسند فرمایا اور جبریل ؑ نے بتا دیا۔ کہ آپ نے فطرتِ اصلیہ کو پسند فرمایا۔ اگر

شراب کا برتن آپ لے لیتے تو آپ کی امت بھٹک جاتی۔ دیکھو نبی صلعم
اپنی امت کو فطرت پر جمع کرنے والے تھے اور دودھ سے یہی مراد ہے
کہ امت فطرت کو پسند کرے اور خمر سے یہ مراد تھی کہ لذاتِ دنیا کو پسند کرے۔
۱۲۔ پانچ نمازوں کا تقرر بھی زبانِ تجویزی سے ہوا۔ یہ پانچ ثواب میں
پچاس کے برابر ہیں، گویا رب کریم نے آہستہ آہستہ یہ سمجھایا ہے کہ
ثواب تو دپچاس کے برابر کا کامل ہے۔ ہرج اور مرج اٹھا دیا گیا ہے
یہ مطلب حضرت موسیٰ ع کی سند سے متمثل کیا گیا ہے۔ کیونکہ جناب مروج
امت کی اصلاح و درستی اور اصولِ سیاستِ امت کی شناخت میں
اکثر انبیاء سے بڑھے ہوئے ہیں"۔ (انتہیٰ)

کیا یہ وہی رات ہے؟

یہاں ہمارے موضوع کے پیشِ نظر اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ اس رات کو
جس کے کچھ روحانی اور اخلاقی کوائف پڑھ چکے ہو اور انہیں جس حد تک سمجھ سکتے ہو، یا
سمجھ چکے ہو۔ کیا آج چودہ سو سال بعد آنے والی ۱۴۰۴ھ کے ماہِ رجب کی ستائیسویں رات
وہی رات ہے؟ اگر اسے وہی رات خیال کرتے ہو اور اس رات کو واقعی معراج ہی کی رات
یقین کرتے ہو تو کیا آج اس تقریب پر جو عوامل انجام دیے جاتے ہیں اور عوامل کو شبِ معراج
کی نورانی واردات، انبیائے کرام کے ذکر، حضورِ اکرم کے علوِ مرتبت، نماز کے احکام،
بالخصوص حضورؐ کا دودھ کے پیالے کو اٹھا کر قوم کے لیے دینِ فطرت کو پسند کرنا غرض
غیر محدود روحانی برکات کے ساتھ آپ لوگوں کی ان حرکات کا تعلق ہو جو اس ۲۷ رجب کی
رات کو شبِ معراج سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔

ا۔ چراغاں کا جو اہتمام کیا جاتا ہے اور اس پر لاکھوں کا اسراف عمل میں آتا ہے
کیا عرب جیسے غیر متمدن ملک میں اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ فرض کر لیا جائے، کہ

صحابہ رضؓ نے نبوت کے دسویں سال کے بعد ہر سال چراغاں کر کے شبِ معراج کا جشن آپ کی زندگی کے باقی تیرہ سال منایا ہو اور حضور خود بھی بہ نفسِ نفیس ان جشنوں میں شامل ہوتے رہے ہوں۔

اہلِ لغت سے پوچھو! بتائیں گے کہ سراج سرے سے عربی زبان کا لفظ ہی نہیں یہ فارسی زبان کے لفظ "چراغ" کا معرب ہے۔ جس ملک کی زبان میں چراغ کے معنی دینے والا کوئی لفظ ہی نہ ہو، وہاں چراغاں کے کیا معنی؟

کیا یہ مشہور روایت نہیں ہے کہ حضور اکرم ؐ کے مرض الموت میں آخری رات، حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ نے ہمسایہ کے گھر سے روشنی کا انتظام کیا؟

عربوں کی بدوی زندگی میں ان تکلفات کا نام و نشان تک نہ تھا۔

حلوے اور پوریوں سے اس تقریب کو کیا تعلق ہے؟ جلسے اور جلوسوں سے اس کو کیا واسطہ؟ اور چراغاں جیسے فعل کا تو عرب سے کوئی سراغ ہی نہیں ملتا۔

ہاں البتہ ہندوؤں کی تاریخی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اجودھیا پوری کے راجہ دسرتھ کا بیٹا شری رام چندر جی اپنی سوتیلی ماں کیکئی کے مجبور کرنے سے بن باس (جلاوطنی اور جنگل کی زندگی) کے چودہ سال پورے کر کے جب راجدھانی اجودھیا پوری میں واپس آیا تو اس کے ماں باپ اور دیگر متعلقین اور راجہ دسرتھ کی دیگر رعایا نے دیپ مالا جگا کر یعنی چراغاں کر کے جشن منایا یا جشن منا کر چراغاں کیا۔ یہیں سے ہندوؤں میں دیوالی کی رسم چلی اور اب تک چلی آ رہی ہے۔

اب اسے دیوالی یا دیوالی کی دیپ مالا کہو یا شبِ معراج اور چراغاں کا نام دو، آپ کو اختیار ہے!

ورنہ رسولِ اکرم ؐ اور صحابہ رضؓ سے تو اس جشن کا نام و نشان نظر نہیں آتا۔

ماہِ شعبان کی پندرھویں رات ــ شب برات

کیا ہے اور کیا سمجھ لیا گیا ہے؟

ہر قوم میں کم و بیش یہ رواج موجود ہے کہ سال کے اندر کچھ دن خصوصیت کے ساتھ منائے جاتے ہیں۔ اسی طرح دیکھا دیکھی یا قبولِ اسلام سے پہلے کی رسوم و عادات ہی کی یاد میں مسلمانوں میں بھی کئی دن ایسے رواج پا چکے ہیں جنہیں مخصوص تو کیا گیا اسلامی روایات کے تحت لیکن منایا گیا انہیں طور طریقوں کے مطابق جو کسی ملک اور کسی قوم کے سابق طریقے تھے۔

ان دنوں کے متعلق کچھ کہنے سننے سے پہلے یہ سوچنا ضروری ہے کہ ایسے دن منانے کے سلسلہ میں اسلام کا مزاج کیا ہے؟ کیا اسلام کسی دن کو کھیل تماشوں کے لیے مناتا ہے یا کسی دینی اور اخلاقی مقصد کے تحت؟

اگر ان دنوں کے منانے میں کھیل تماشا مقصود نہیں بلکہ کوئی روحانی تحریک یا کسی اخلاقی تعلیم و تہذیب اور اصلاح کی طرف توجہ دلانا مطلوب ہے، تو پھر دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور تجلیات کے نزول کا کوئی تعلق دنوں تہواروں خاص تاریخوں، وقتوں اور موسموں سے بھی ہے؟ یا اس حی و قیوم، ازلی و ابدی، لازوال ہستی کا فیضانِ رحمت ہر وقت اور ہر آن ایک جیسا جاری و ساری ہے؟

ان دو بنیادی امور کو پیشِ نظر رکھ کر اسلامی تقریبات پر غور کرنے سے دوسری قوموں کے تہواروں اور تقریبوں کے مقابلے میں ان تقریبات کی امتیازی شان کھل کر سامنے آجائے گی۔) اسلامی تہواروں کی خوبیاں

(۱۔ پہلی حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں کوئی مخصوص دن ایسا نہیں جو کھیل تماشے کے لیے وقف ہو، بلکہ اسلام کا مزاج یہ ہے کہ وہ عیدوں جیسے شان و شوکت کے اظہار والے دنوں کو بھی عبادت کی تعلیم اور روحانی تحریک کا مظہر بنا دیتا ہے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ اسلام اپنے نظامِ معاشرت، تمدن و تہذیب اور کسی روحانی تحریک کے لیے کسی موسم اور وقت کا پابند نہیں، بلکہ موسم اور اوقات اس نظریاتی آفاقی دین کے فطری نظام کے تحت چلنے کے لیے مجبور ہیں)

یہی وجہ ہے کہ اس کی تقریبات دوسری قوموں کی طرح موسموں کی تحریک سے متاثر نہیں ہوتیں جن میں بہار و خزاں کے مادی تاثرات کو دخل ہو یا کسی فصلی جنس کی برداشت فراہمی کے حیوانی جذبہ کی انگیز کا تعلق ہو۔ یہ ہر موسم کی پابندی سے آزاد اور ہر نفسانی کشش سے بے نیاز اپنی ایک منفرد چال پر چلتا ہے جس کے سامنے وقت کی ہر قوت اور موسم کی ہر مادی تحریک پامال اور مقہور ہو جاتی ہے۔

ہر ملک کی آب و ہوا اور موسم ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ موسم پر پکنے والے پھل اور خوردنی اجناس کی تیاری کے اوقات اور تاریخیں مختلف ہیں اور ہمیشہ مختلف رہتی ہیں۔ اس لیے ان حیوانی تحریکوں کی بنا پر ہر قوم جو اپنے اپنے ملک میں خاص خاص دن مناتی ہے اور وہ دن ہر ملک میں لازماً مختلف تاریخوں پر آتے ہیں اور منائے جاتے ہیں جس سے مختلف ممالک کے بنی نوعِ انسان کسی طرح اپنے معاشرتی رسوم و آداب میں یکسانی، ہمواری، یک رنگی اور نوعی اجتماعیت ہرگز پیدا نہیں کر سکتے اور نہ ہی ان بنیادوں پر ابھرنے والے جذبات کسی روحانی اور اخلاقی تحریک میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔

اسلام کا دینی نظام، نظامِ شمسی کا پابند نہیں بلکہ قمری حساب کے مطابق چلتا ہے تاکہ کسی موسم کے اثر کا دخل اس میں شامل نہ ہو سکے اور تمام روئے زمین کے مسلمانوں میں اس نظام کی پابندی کے اثر سے ایسی یکسانی یگانگت اور وحدت پائی جائے جس پر کوئی مادی تحریک اثر انداز نہ ہو۔

اب انہی دو بنیادی امُور کو سامنے رکھ کر کہ اسلامی تقریبات میں نہ کھیل تماشے کا کوئی دخل ہے اور نہ خدا کا فیضانِ رحمت کسی موسم اور وقت کا پابند ہے شب برات کی اسلامی تقریب پر غور کرو اور اس سلسلہ میں احادیث کی روایات بھی ملاحظہ کرو۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضہ کا کہنا ہے کہ ایک شب میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلعم گھر میں موجود نہیں ہیں تلاش کیا تو معلوم ہُوا کہ بقیع الغرقد میں ہیں۔ آپ کو یہاں میرے آنے پر تعجب ہُوا، فرمایا کہیں تمہارا خیال یہ تو نہیں تھا کہ میں کسی زیادتی کا ارتکاب کرنے والا ہوں بعرض کیا جی نہیں۔ میرا گمان تھا کہ آپ یہیں کہیں ضرورت سے گئے ہیں۔ اس گمان کی تصدیق کے لیے نکلی تھی کہ آپ کو یہاں پایا۔ آپ نے فرمایا "یہ مبارک شب ہے کہ اللہ تعالےٰ بندوں کے بہت قریب ہو جاتا ہے اور آسمانِ دنیا پر تشریف لے آتا ہے اور بخشش و عفو کی وہ گرم بازاری ہوتی ہے کہ بنی کلب کی بھیڑ بکریوں کے بال اتنے نہیں ہوں گے جتنی کہ اس رات کی بخششیں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔"

حضرت عائشہ رضہ سے ایک دوسری روایت ہے۔ ارشاد فرمایا: "اے حمیرا! یہ نصف شعبان کی رات ایسی ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اپنے بندوں کے قریب ہو جاتی ہیں۔ اس وقت وہ ہر اُس شخص پر بخشش و کرم کی بارش کرتا ہے جو اس سے بخشش طلب کرتا ہے اور ہر اس شخص پر رحم فرماتا ہے جو رحم چاہتا ہے۔ ہاں ان لوگوں کو اس بخشش اور عفو کی تقسیم میں شریک نہیں کرتا جن کے دلوں میں حسد اور کینہ کی آگ سلگ رہی ہے۔"

ایک حدیث میں آتا ہے کہ اس رات اللہ کی رحمتیں تمام اہل زمین کو گھیر لیتی ہیں سوائے اس شخص کے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی ذاتِ گرامی میں دوسروں کو شریک ٹھہرایا۔ یا حسد و کینہ کا اظہار کیا۔

بعض روایات میں اس رات سو رکعت یا دس رکعت نماز نفل پڑھنا مستحب کہا گیا ہے۔ سو رکعت پڑھیں تو ہر رکعت میں دس مرتبہ اور اگر دس رکعت پڑھی جائیں تو ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد سو مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھی جائے۔

ان روایات پر اہلِ علم نے بڑی بڑی طویل بحثیں کی ہیں لیکن اکثر ثقہ حضرات نے ان روایات کو وضعی، کمزور اور بے سند ہی قرار دیا ہے۔

کسی رات کو عبادت کے لیے مخصوص کر لینا

کسی رات کی فضیلت اپنی جگہ پر ہے لیکن اسے کسی مخصوص عبادت کے لیے خاص کر لینا جس پر قرآن، سنت میں کوئی ثبوت نہ ہو، اصولاً درست نہیں ہوگا وہ بدعت ہی کے ضمن میں آئے گی۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضؓ سے مروی ہے:۔

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم لا تخصوا لیلۃ الجمعۃ بقیام من بین اللیالی ولا تخصوا یومھا بالصیام من بین الایام الا ان یکون فی صوم یصومہ احدکم

جمعہ کی رات کو قیام کے لیے مخصوص نہ کرو اور نہ جمعہ کے دن کو روزہ کے لیے خاص کیا جائے البتہ پہلے سے روزہ رکھتا چلا آرہا ہے تو جمعہ کا روزہ رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔

اگر راتوں میں سے کسی رات کو عبادت کے لیے خاص کرنا جائز ہوتا تو

جمعہ کی رات سے کون سی رات افضل تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث سے یہ امر ثابت ہے جس صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات کے قیام کی تخصیص کو منع فرما دیا ہے تو اس سے ثابت ہوا کہ اس کے علاوہ بدرجہ اولیٰ دوسری راتوں کو عبادت کے لیے خاص کرنا جائز نہیں تاوقتیکہ اس کے لیے کوئی صریح دلیل نہ ہو۔

اس میں یہی حکمت مضمر ہے کہ اصل چیز عمل ہے نہ کہ کوئی دن رات یا کوئی وقت (کتاب کے شروع میں یہ بحث بڑی تفصیل سے لکھی جا چکی ہے وہاں دیکھیں)

ان فرامین نبوی اور واضح حقائق کی روشنی میں مسلمانوں کے موجودہ معمولات پر آتش بازی سے لے کر مٹھائیوں کے جشن اور حلوہ پوریوں کے تحفہ تحائف تک غور کرو کہ اس مبارک تقریب کے ساتھ ان بدعات کو کوئی تعلق کسی عقلی یا نقلی بنیاد پر نظر آسکتا ہے؟ کہاں خدا کی رحمتوں کا نزول اور کہاں حیوانی جذبات کا ہجوم اور خورد و نوش کے اللّے تللّے؟ اس خالص روحانیت اور اس سرتاپا حیوانیت کا آپس میں آخر کیا جوڑ ہے؟

ایک سوال!

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بدعات یا رسوم جو مدت سے ایک جیسے چلے آرہے ہیں اور علماء کی ہدایت و تلقین، حکام وقت کی مسلسل زجر و توبیخ بلکہ قانونی سزاؤں اور پابندیوں اور سختیوں کے باوجود ختم نہیں ہوتے، آخر مسلمانوں میں کہاں سے آگئے ہیں؟

سو اس سلسلہ میں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ ان بدرسمیوں کے متعلق یہ سوچنے کی ضرورت نہیں کہ کہاں سے آگئی ہیں، دراصل ہم ہندوستانیوں میں مسلمان ہو جانے

کے بعد یہ ہندووانہ رسوم گئی ہی نہیں نام بدل گئے ہیں کام میں تبدیلی نہیں آئی۔ کھڑک سنگھ کا نام دین محمد تو رکھ دیا گیا۔ لیکن دین کو دل و دماغ میں جگہ نہیں ملی۔ یہ رسوم بدستور معاشرے میں رائج چلی آرہی ہیں۔

(اسلام کسی خاص قوم، کسی خاص ملک، کسی خاص نسل کا دین نہیں۔ اسلام چند مخصوص عقائد کی پابندی کا نام ہے۔ جس قوم، جس ملک اور جس نسل کے کسی فرد نے ان اصول کی پابندی اختیار کر لی، وہ اس اصولی جماعت میں شامل ہو گیا۔ چونکہ ہر قوم، ہر ملک و نسل کے لوگ اس میں شامل ہوتے ہیں جو اپنے اپنے ملکوں، قوموں اور نسلوں کے مختلف رسوم و آداب کے پابند تھے۔ اسلام میں شامل ہو جانے کے باوجود اپنے موروثی رسوم و آداب کا کچھ نہ کچھ حصہ جو ساتھ لائے، ان کی زندگی میں شامل رہا۔ بالکل اس طرح جس طرح کسی گلاس یا بوتل کو الٹا کر وہ شے ساری کی ساری بھی گرا دی جائے، جو اس میں تھی، جب بھی اس کا کچھ نہ کچھ حصہ گلاس یا بوتل سے لپٹا رہ جاتا ہے اور کچھ نہیں تو رنگ اور بو ہی باقی رہ جاتی ہے۔)

اسی طرح اپنے پہلے آبائی رسوم و آداب کا اثر یہ لوگ ساتھ لائے ہیں اور جہاں خالص دینی ماحول میں ان لوگوں کو تربیت حاصل کرنے کا موقع نہیں مل سکا، وہاں یہ اثرات ان کی معاشری زندگی میں شامل رہے۔ ان عوامل کے بھی نام آدمیوں کی طرح ضرور تبدیل ہو گئے لیکن ان کی شکل و صورت وہی رہی جو تھی۔ ہندو معاشرے میں اپنے راہنماؤں مہنتوں، پروہتوں اور سنتوا ا کی مدت کے دن پر ان کی سمادھوں پر ہر سال برسی منائی جاتی تھی جس پر مرد و زن اکٹھے ہوتے اور راگ رنگ سے یہ دن منایا جاتا، ان لوگوں نے مسلمان ہو کر بزرگان دین کے مزارات پر عرس اور قوالی کے نام پر یہی عوامل انجام دیے۔ شرادھ کے تمام طور طریقے یوم عاشورا پر منطبق کر دیے۔ دیوالی کے چراغاں کو شب معراج کے موقعہ پر رکھ دیا اور اسی طرح دسہرہ کی آتش بازی شعبان کی پندرھویں تاریخ پر چھوڑ

وی علیٰ ہذا القیاس!

لہٰذا یہ وہ رسوم و آداب ہیں جو کہیں سے آ کر ہمارے معاشرے میں شامل نہیں ہوتے بلکہ سرے سے گئے ہی نہیں۔

غرض یہ طور طریقے اور رسوم و آداب تمام ان محرکات پر مبنی ہیں جو فصلوں اور موسموں کے تحت عمل میں آتے ہیں لیکن اسلام کا نظام ان تمام مادی اثرات سے بلند و بالاتر اور بے نیاز ایک منفرد نظام ہے جو کسی موسم اور فصل کا پابند نہیں اس کی تقریبات چاند کے حساب سے آتی ہیں اور ہر ملک کے لیے ایک جیسی ہیں اور ہر جگہ سدا بہار کی طرح منائی جاتی ہیں۔

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

لیلۃ القدر

(ان تقریبات کے سلسلہ میں جو مسلمانوں کے لیے جاذب توجہ بنی ہوئی ہیں ایک لیلۃ القدر بھی ہے چونکہ اس کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے اور نزولِ قرآن کی تقریب میں آیا ہے اور پھر ایک مستقل سورت بھی سورۃ قدر کے نام سے ، ۹۷ نمبر پر تیسویں پارہ میں موجود ہے جس میں قرآن پاک کے نازل ہونے کا ذکر کرتے ہوئے کسی خاص تاریخ کا تعین کیے بغیر اس رات کا بھی ذکر فرمایا گیا ہے۔ اس لیے یہ رات بھی ایک تقریب بنا لی گئی۔)

ایک اقتباس

اس سلسلہ میں سب سے پہلے مناسب ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کی تلاوت فرمائی جائے۔

ہم ذیل میں سورۃ مذکورہ مع تفسیر استاذ تفسیر خواجہ محمد عبدالحی صاحب فاروقی مرحوم ذیل میں نقل کرتے ہیں تاکہ سورہ کا مفہوم سمجھنا آسان ہو جائے۔

القدر - آیات ۵

تلخیص مضامین: اس سورۃ میں لیلۃ القدر کے فضائل و برکات بیان کرکے

بتایا ہے اسی شب میں قرآن کا نزول ہوا ہے اور اس نے اس شب کی تمام خصوصیات کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے، پس اگر تم اس کتاب عزیز اور حبل اللہ الجلیل سے تمسک و اعتصام کرو گے تو ان تمام صفات و مختصات کو حاصل کر لو گے جو اس شب کی بیان کی گئی ہیں۔

العروۃ الوثقیٰ

شب قدر کی بزرگی

إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ فِى لَيْلَةِ ٱلْقَدْرِ ۝ وَمَآ أَدْرَىٰكَ مَا لَيْلَةُ ٱلْقَدْرِ ۝ لَيْلَةُ ٱلْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝ تَنَزَّلُ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ وَٱلرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِم مِّن كُلِّ أَمْرٍ ۝ سَلَٰمٌ هِىَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ ٱلْفَجْرِ ۝

ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل کرنا شروع کیا اور تمہیں کیا معلوم کہ شب قدر کیا ہے شب قدر ہزار مہینہ سے بہتر ہے اس میں روح الامین اور فرشتے ہر کام کے انتظام کے لیے اپنے پروردگار کے حکم سے اترتے ہیں یہ رات طلوع صبح تک امان اور سلامتی ہے۔

دنیا کی بقا مادیات و روحانیات کی آویزش پر ہے، مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس تصادم اور کشمکش میں ملکیت پر بہیمیت کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت چاروں طرف فسق و فجور کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ پس یکایک اللہ کی رحمت بھی جوش مارتی ہے۔ اور پھر روحانیت کو مادیت پر غلبہ نصیب ہو جاتا ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں کبھی موسم بہار سے قلوب و افکار میں تر و تازگی پیدا ہوتی ہے اور کبھی خزاں کے

جھونکے ان کو پژمردہ کر دیتے ہیں۔

نبی کی بعثت قوم کے لیے بہار کا حکم رکھتی ہے۔ اس کی وجہ سے نزولِ روحانیت ہوتا ہے اور تمام لوگوں میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے مگر جب اس کی تعلیم سے انحراف شروع ہو تو پھر خزاں اپنا اثر دکھاتی ہے اور قوائے عملیہ پر عالمِ ممات طاری ہو جاتا ہے۔ اس موت کے بعد نئی زندگی دینے کے لیے دوسرا نبی بھیج دیا جاتا ہے، جس شب کو اس قسم کی روحانیت کا نزول ہو اس کو لیلۃ القدر کہتے ہیں۔

نزولِ قرآن

اسی شب میں اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل کیا کہ نوعِ انسانی کی رُشد و ہدایت کا باعث ہو ، (تاکہ لوگوں کو اندھیروں سے نور کی طرف لائے)

ظاہر ہے کہ قرآن مختلف اوقات میں نازل ہوتا رہا ہے اور اس کی تکمیل میں ۲۳ سال لگ گئے۔ یہاں صرف یہ بیان کرنا ہے کہ یہ کتاب عزیز پہلی مرتبہ رمضان یا شب قدر کو نازل ہوئی۔ گزشتہ سورۃ سے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اولین الہام کونسا ہُوا اور اس سورت سے اس کی ابتدا کا پتہ لگ گیا۔ چنانچہ قرآن کی دوسری آیات بھی اسی کی تصدیق کرتی ہیں (سورۃ بقرمیں ہے:۔

شھر رمضان الذی انزل فیه	روزوں کا مہینہ رمضان کا مہینہ
القرآن ھدی للناس وبینات	ہے، جس میں قرآن اول اول نازل
من الھدی والفرقان ط	ہُوا۔ جو لوگوں کا راہنما ہے اور جس
	میں ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں
	اور جو حق و باطل کو الگ الگ

کرنے والا ہے۔

• سورۂ دخان میں ہے:-

إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ فِى لَيْلَةٍ مُّبَٰرَكَةٍ ۚ إِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ ۝ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ ۝ أَمْرًا مِّنْ عِندِنَآ ۚ إِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ ۝ رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلْعَلِيمُ ۝

ہم نے اس کو مبارک رات میں نازل فرمایا ہم تو رستہ دکھانے والے ہیں، اسی رات میں تمام حکمت کے کام فیصلہ کیے جاتے ہیں، یعنی ہمارے ہاں سے حکم ہو کر، بے شک ہم ہی پیغمبر کو بھیجتے ہیں، یہ تمہارے پروردگار کی رحمت ہے، وہ تو سننے والا جاننے والا ہے۔

جمہور امت کا اتفاق ہے کہ لیلۃ القدر رمضان میں اور اس کے آخری دس روز کی طاق راتوں میں ہوتی ہے۔

خصوصیاتِ شب

جس طرح موسم بہار نباتات میں نئی روح پھونک دیتا ہے، اسی طرح یہ شب روحانیت کے نزول کے لیے مخصوص ہے، اس ایک شب میں عبادات کا اجر و ثواب ایک ہزار ماہ کی عبادت کے برابر ہے، اس میں ملائکہ زمین پر نازل ہوتے ہیں، جو یک سر خیر و برکت ہوتے ہیں۔ اور اس لیے تمام کائناتِ ارضی ایک بقعۂ رحمت بن جاتی ہے، یہ دلفریب و کیف پرور نظارہ طلوعِ فجر تک رہتا ہے!

تنبیہ و اعتبار

لسانِ الٰہی نے اس شب کی اعلیٰ ترین خصوصیت یہ بتائی۔ کہ ہزار ماہ سے بہتر

یہ ایک شب ہے۔ احادیث میں اس کے تلاش کرنے کی خاص طور پر تاکید ہے مگر بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص تمام عمر اس کی جستجو میں رہے اور وہ کامیاب نہ ہو اس لیے خدا نے اس شب میں قرآن نازل کیا جس نے اس کی تمام برکتوں اور رحمتوں کو اپنے اندر جذب کر لیا پس جب کبھی دنیا میں روحانیت کا تنزل ہوگا تو اس کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے جس قدر خارجی اعانت کی ضرورت ہوگی اس کو صرف قرآن ہی پورا کر سکے گا۔ اور شب قدر کے نہ پانے والے جب اس کتاب عزیز سے تمسک و اعتصام کر لیں گے تو وہ ان تمام فیوض و برکات سے بہرہ اندوز ہوں گے جو اس شب کے لیے مخصوص ہیں، کیونکہ قرآن اسی رات میں نازل ہوا اور اس نے اس کی تمام خیر و برکت کو اپنے اندر لے لیا۔ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ ط

تبصرہ

(اس رات کے متعلق عوام میں عجیب عجیب روایات مشہور ہیں۔ جن کا مرکزی تصور یہی ہے کہ اس رات میں ایک ساعت یا چند لمحے ایسے آتے ہیں کہ یک دم روشنی ہو جاتی ہے، پانی دودھ بن جاتا ہے، درخت سجدے میں گر پڑتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اور سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس وقت جو مانگو مل جاتا ہے۔

ان روایات پر بحث کرنا محض تضیعِ اوقات ہے، اس کا وہی مختصر جواب کافی ہے جو قرآن حکیم نے ھی حتّٰی مطلع الفجر ٥ (یہ صورتِ حال ساری رات طلوعِ صبح تک قائم رہتی ہے) فرما کر دے دیا ہے کہ وہ ایک لمحہ نہیں ساری رات یہی کیفیت رہتی ہے۔

غرض جس رات میں آسمان سے خیر و برکات نازل ہوئیں اور تمام نعمتوں کا مجموعہ قرآن پاک نازل ہوا، وہ لیلۃ القدر ہے۔

پھر چونکہ اس رات کی قرآن کریم بلکہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی خاص تاریخ متعین نہیں کی گئی اور صرف یہی معلوم ہو سکا ہے کہ یہ رات ماہِ رمضان اور وہ بھی آخری عشرہ کی کوئی سی طاق رات ہے؛ اس لیے مسلمان شب پرستی کے لیے اسے پکڑ نہیں سکے کہ اسے اپنے اپنے رسوم و رواجات کے مطابق تہوار کی صورت میں منا سکیں اور تلاش و جستجو کی کوششوں تک ہی اپنی ارادتوں، عقیدتوں کے آداب و شئون کو محدود رکھ سکے ہیں اور آج تک رکھتے چلے آ رہے ہیں۔ البتہ تقریب پرستی کا شوق اسی تلاش ہی کو تقریب کا رنگ دے کر پورا کر رہے ہیں۔

رمضان کے آخری عشرہ کی راتوں میں "شبینے" منا کر وہ خصوصیت دینا چاہتے ہیں جو کسی مصلحت کے تحت اسے نہیں دی گئی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا ہے

فقد اریتُ ھذہ اللیلۃ ثم اُنسیتھا۔ مجھے یہ رات دکھائی گئی اور پھر بھلا دی گئی۔

نمازِ تراویح میں سارا سارا قرآن ختم کرنے کی رسم اسی تلاش و جستجو کی کوششیں ہیں۔ ورنہ کتاب و سنت کے کسی حکم سے اس تعین اور ان رسوم و آداب کے عمل کا کوئی تعلق نہیں۔ قرآن جو غور و تدبر کے لیے نازل ہوا ہے اور اسلامی زندگی کے لیے ایک دستور العمل ہے، اس کو اس طرح صرف تھوڑے وقت میں ختم کرنے کی غرض سے جلد جلد پڑھنا اور سننا اکثر اکابر صحابہ نے مناسب نہیں سمجھا۔ اس میں ترتیل اور پھر فہم و تفہیم الزم اللوازم ہے۔

باقی رہی اس رات کی فضیلت، سو قرآن کریم نے صاف الفاظ میں بیان فرما دی ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اس رات میں انسانی کائنات کی خیر و صلاح بلکہ ساری مخلوق کے سود و بہبود کے سلسلہ میں نزولِ قرآن کی حیثیت سے اتنا بڑا کام ہوا ہے جو کبھی ہزار مہینوں میں کبھی نہیں ہوا — البتہ فضیلت کی وجہ؟

سورہ بھی قرآن ہی نے بالوضاحت بیان فرمادی ہے کہ وہ صرف اور صرف نزول قرآن کا شرف ہے۔ بابرکت اور بلند قدر رات کی وجہ سے اس میں قرآن نازل نہیں ہوا بلکہ قرآن عزیز کے نزول نے اس رات کو بابرکت اور بلند قدر بنایا ہے۔

لہٰذا وہ رات جس کی تاریخ کا تعین قرآن اور حدیث نے نہیں فرمایا، تلاش کرنے والے کو ملے نہ ملے، قرآن تو کہیں گیا نہیں موجود چلا آرہا ہے، موجود ہے اور پوری شان سے یوں کا توں ہمیشہ تک موجود رہے گا۔ اس سے ہر وقت کوئی رات ہو یا کوئی دن فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور ساری خیر و برکات اسی میں شامل ہو جاتی ہیں۔ خدا توفیق دے۔

ع ہر شب شب قدر است گر قدر بدانی

عینک لگا کر اس سے دیکھنے کا کام نہ لیا جائے اور صرف عینک کے وجود ہی کو اصل مدعا یقین کر لیا جائے اور اسے جیب میں محفوظ رکھنا کافی سمجھ لیا جائے۔ فرمائیے! آخر یہ کون سی دانش مندی ہے؟ پانی خواہ آب حیات ہی کیوں نہ ہو پینے ہی سے پیاس بجھ سکتی ہے انسے الماری میں محفوظ رکھ چھوڑنے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

نصف شعبان کی رات کے بیان میں صحیح مسلم کی حدیث بروایت حضرت ابوہریرہ رضؓ گزر چکی ہے۔ اسے ایک مرتبہ پھر دیکھ لو۔

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم لا تخصوا لیلۃ الجمعۃ بقیام من بین اللیالی ولا تخصوا یومہا بالصیام من بین الایام الا ان یکون فی صوم یصومہ احدکم	جمعہ کی رات کو قیام کے لیے مخصوص نہ کرو اور نہ جمعہ کے دن کو روزہ کے لیے خاص کیا جائے البتہ پہلے سے جو شخص روزہ رکھتا چلا آرہا ہے تو جمعہ کا روزہ رکھنے

میں کوئی حرج نہیں۔

(کسی رات یا دن کو خصوصیت دے کر از خود عبادت کے لیے خاص کر لینے سے غالباً اسی لیے منع فرما دیا گیا ہے کہ دنوں یا راتوں میں کسی سعادت یا نحوست کا اثر نہ سمجھ لیا جائے کیونکہ اصولاً کوئی دن صرف دن ہونے کی حیثیت سے نہ سعد ہے اور نہ نحس، البتہ جن دنوں یا راتوں میں کسی عبادت کو حکم دے کر مشروع قرار دے دیا گیا ہے وہ عبادت یقیناً باعث اجر و ثواب ہے اور وہ ان دنوں اور راتوں کو بھی اس شخص کے لیے سعد اور مبارک بنا دے گی جو حسب حکم اس عبادت کو ادا کریگا۔ اور عبادت نہ کرنے والے کے لیے وہ اور بھی نحوست اور بد نصیبی کا باعث بن جائیگی۔

مولانا محمد عنایت اللہ وارثی کی دیگر تصانیف

خدا ایک کیوں؟ اس کتاب میں مولانا نے عقلی و نقلی دلائل سے اس سوال کا جواب دیا ہے کہ خدائے واحد کو ایک خدا ہی تسلیم کرنے سے ہماری دنیوی اور اُخروی مشکلات حل ہو سکتی ہیں۔ کتابت و طباعت آفسیٹ۔ کاغذ سفید۔ قیمت ۰۰۔ ۳۶

غزوات مقدس: اس کتاب میں مولانا نے نہایت اچھوتا انداز اختیار کیا ہے پہلے جنگ کے اسباب و علل۔ پھر واقعات کے بعد نتائج۔ کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ کتابت و طباعت آفسیٹ۔ کاغذ سفید۔ مجلد ڈائی دار قیمت ۵۰۔ ۲۸ روپے

گرد سفر: مولانا کی خود نوشت سوانحیات ہے۔ آپ کی ساری زندگی مجاہدانہ گزری ہے۔ یہ کتاب ہر دیہاتی شہری کے لیے یکساں کارآمد ہے اور ہر مسلمان کے لیے گائیڈ لائن کا کام دے گی۔ کتابت و طباعت آفسیٹ۔ کاغذ سفید۔ قیمت: ۴۵/۰۰

پروگریسو بکس۔ ۴۰۔ اردو بازار۔ لاہور

ظفر بک ایجنسی۔ فیض آباد، سرگودھا روڈ۔ جامعہ مسجد سٹریٹ۔ گجرات

حرفِ آخر

جو دن آکر گزر جاتا ہے، وہ پھر واپس نہیں آتا۔ یقیناً نہیں آتا اور نہیں آسکتا آج کسی دن کو تاریخ کے لحاظ سے کسی گزشتہ سال کی کوئی وہی تاریخ خیال کرو گے، تو وہ تاریخ یقیناً گزر چکی ہے۔ آج کا یہ سال وہ گزشتہ سال نہیں۔ بالخصوص قمری ن کے حساب کی رُو سے وہ موسم بھی نہیں، وہ ماحول نہیں، وہ لوگ نہیں۔ گویا زمین اور آسمان بدل چکا ہے، ایک نئی دنیا سامنے ہے۔

آج کے کسی دن کو وہی گزرا ہوا دن اور کسی تاریخ کو وہی گزری ہوئی تاریخ، کسی وقت کو وہی گزرا ہوا وقت تصور کرنا جو سالہا سال ہوئے، گزر چکا ہے۔ انتہائی خود فریبی، بدیہی مغالطہ اور ایسی صریح وہم پرستی ہے۔ جس پر کسی خارجی عقلی اور نقلی دلیل کی ضرورت نہیں۔

اگر یہ حقائق صحیح اور درست ہیں تو تقریب پرستی سے بڑھ کر موہوم، بے معنی اور غیر معقول حرکت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

زندہ قومیں اپنے عمل کی ٹھوس حقیقت پر ایمان رکھتی ہیں، وہم پر نہیں۔ ایک حال پر نہ رہنے والے زمانے اور وقت کو زندگی کی بنیاد نہیں بناتیں، اپنی ذات پر اعتماد کرتی ہیں اور وقت کو اپنی گرفت میں لے کر اسے عمل پر استعمال کرتی ہیں۔ وقت کے

انتظار میں نہیں رہتیں، وقت ان کا انتظار کرتا ہے۔

زمانے کی یہ گردش جاودانہ
حقیقت ایک تو باقی فسانہ!
کسی نے دوش دیکھا ہے نہ فردا
فقط امروز ہے تیرا زمانہ

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

رہا یادگاروں کا سوال بالخصوص اُن زندۂ جاوید ہستیوں کی یادگاروں کا، جن کی یادیں ایمان کو تازہ رکھتی ہیں سچا ایمان جن یادوں کو تازہ رکھتا ہے۔ سو یہ مبارک یادیں ہمارے ان تاریخوں کے پابند سالانہ جلسوں اور جلوسوں کی محتاج نہیں۔ روز و شب اور ماہ و سال کے خالق نے خود ان کا ایسا اہتمام کر رکھا ہے جیسا کسی مخلوق سے انجام پانا ممکن ہی نہیں۔

سارے روئے زمین پر بلکہ فضائے آسمانی میں کون ہے جو اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا رُوح پرور اعلان، اعلان ہی نہیں، پیغام اور پھر پیغام ہی نہیں، پیغام دینے والے کے کام کی صدا سن کر رات کی تاریکیوں سے نکل کر دن کی روشنی میں آنکھ نہ کھولتا ہو؟ روئے زمین کے مختلف ممالک کے مختلف اوقات میں کوئی ایسا وقت نہیں ہوتا کہ یہ مبارک آواز کانوں کے پردوں سے گزر کر دل کا دروازہ نہ کھٹکھٹاتی ہو، خواہ کوئی سننا چاہے یا نہ چاہے۔

دربارِ نبوت کے شاعر حضرت حسّان رضؓ نے یوں ہی نہیں کہہ دیا کہ:

وضم الالٰہ اسم النبی مع اسمہ اذ قال فی الخمس المؤذن اشہد

(خدا نے اپنے نام کے ساتھ نبی کے نام کو ضم کر دیا، جب کہ پانچ وقت مؤذن اَشْھَدُ پکارتا ہے)

اور پھر یاد رکھو کہ "یاد" کا سوال "بھول" کے بعد ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر سرے سے بھول ہی نہیں، تو کوئی یاد اور یادگار بچہ معنی؟

وہ تمہیں یاد کرے جس نے بھلایا ہو کبھی
ہم کبھی تم کو نہ بھولے، نہ کبھی یاد کیا

(وارثیؔ)

مولانا محمدؐ عنایت اللہ وارثی کی دیگر تصانیف

مُرقّع خُوش خطی: خدا کے فضل سے آپ اردو اور عربی کے بہترین خوشنویس ہیں اور استاذ کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس فن پر یہ مرقّع تیار کر کے شائقینِ فن پر بڑا احسان کیا ہے یہ مرقع مبتدیوں اور خوش نویس حضرات کے لیے یکساں کارآمد ہے۔ قیمت نو روپے

گردِ سفر: مولانا کی خود نوشت سوانح حیات ہے۔ یہ کتاب "دیہی آبادی کے نفسیات اور ہندو ذہنیت کا ایک تجرباتی مطالعہ" پر مشتمل ہے جو دیہاتیوں اور شہریوں کیلئے یکساں کارآمد ہے۔
طباعت آفسیٹ۔ قیمت: ۴۵/۰۰ روپے

مسلمان کی دنیا (زیرِ طبع) **نفسیات غلامی** (زیرِ طبع)

پروگریسو بکس ۴۰ - اردو بازار - لاہور
ظفر بک ایجنسی - فیض آباد - سرگودھا روڈ - جامعہ مسجد سٹریٹ - گجرات

(کتابت: میاں سلطان احمد خوشنویس، گجرات - ۸۴/۴/۲۷)

اسلامی تقریبات

سن ہجری کا سال نو، جمعہ، عرس، حج کی
تقریبات، یوم عاشورا، عیدین کی تقریب، میلاد النبیؐ
شبِ معراج، شبِ برات، لیلۃ القدر،
کتاب و سنّت کی روشنی میں

مولانا محمد عنایت اللہ وارثی

پروگریسو بکس ۰ ۴۰-بی اردو بازار ۰ لاہور
فون
۵۲۷۹۵